اسلام کیسے پھیلا؟

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

یہ کتاب عالم اسلام کے مشہور مفکر وصاحبِ قلم، مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کے ایک سلسلۂ مضامین کا مجموعہ ہے، جسے انہوں نے اخبار الجمعیۃ (دہلی) کی ۱۸، ۲۲، ۲۶ اور ۲۹ رجولائی، نیز ۱۰، ۱۴ اور ۱۸ راگست ۱۹۲۵ء کے شماروں میں مسلسل اداریوں کی شکل میں تحریر فرمایا تھا۔ مولانا اس وقت الجمعیۃ کے مدیر تھے اور عمر صرف بائیس سال کی تھی اس نوعمری کے باوجود ان مضامین میں فکر ونظر کی جو گہرائی اور اصابت پائی جاتی ہے وہ ایک ایسی شخصیت کے اندر قدرت کی طرف سے ودیعت ہونی ہی چاہیے تھی جسے آگے چل کر علم کے میدان میں، تن تنہا، اسلامیات کی ایک انسائیکلو پیڈیا، اور عمل کے میدان میں احیائے دین کی مجسم جدوجہد بنتا تھا۔

یہ بیش قیمت مضامین تقریباً نصف صدی سے الجمعیۃ کی پرانی فائلوں میں دبے پڑے تھے۔ جناب شہیر نیازی (کراچی) اور جناب حفیظ الرحمٰن احسن (مہتمم ایوان ادب لاہور) مبارک باد کے مستحق ہیں کہ ان کی کوششوں سے یہ دفینہ منظرِ عام پر آگیا اور یہ مضامین مرتب ہوکر ایک کتاب کی شکل میں شائع ہوگئے۔ اب ان حضرات کے شکریے کے ساتھ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز (نئی دہلی) بھی اسے طبع کر رہا ہے تاکہ ہمارے ملک کے بھی شائقین علم کے لیے اس کی دستیابی آسان ہوجائے۔

مولانا کی معرکۃ الآراء کتاب "الجہاد فی الاسلام" (۱۹۲۷ء) کو ان کی پہلی تصنیف کی حیثیت رہی ہے اگرچہ باقاعدہ اور مستقل تصنیف کی حیثیت سے اوّلیت کا یہ مقام اب بھی اسی کو حاصل رہے گا۔ لیکن اگر "باقاعدہ اور مستقل" حیثیت کی قید سے صرف نظر کرلیا جائے تو اب مولانا کی پہلی تصنیف یہ کتاب (اسلام کا سرچشمہ قوت) قرار پائے گی۔ پھر شاید یہ بات بھی آخری نہ ہو اور آئندہ خود الجمعیۃ ہی کی بقیہ فائلوں میں، یا تاج (جبل پور) اور مسلم (دہلی) کے اوراق میں (جن کے مولانا الجمعیۃ سے بھی پہلے ایڈیٹر رہے ہیں) کسی ڈھونڈنے والے کو کوئی اور بھی سلسلۂ مضامین یا مجموعۂ مضامین ہاتھ آجائے۔ اور وہ کتاب کی شکل اختیار کرکے موصوف کی پہلی تصنیف کہے جانے کا امتیاز حاصل کرلے۔ مولانا جیسے ممتاز مفکرین ومصنفین کے تو ایک ایک جملے تلاش کیے جاتے ہیں۔ اس لیے ان کی قدیم سے قدیم تحریروں کی جستجو بھی بہرحال متوقع ہے۔

یہ مضامین اس زمانے میں لکھے گئے تھے جب برصغیر میں شدھی کی پرشور تحریک چل رہی تھی۔ فضا سخت کشیدہ اور صورت حال دینی لحاظ سے بڑی اضطراب انگیز تھی، انہیں پڑھتے وقت ان کا یہ پس منظر بھی ضرور سامنے رہنا چاہیے۔ اس کتاب کے مطالعے سے صرف یہی نہیں واضح ہوتا کہ مصنف نے اسلام کے اصل سرچشمۂ قوت کی بالکل صحیح نشان دہی کی ہے، بلکہ یہ حقیقت بھی روشنی میں آجاتی ہے کہ ان کے یہاں ایک فکری تسلسل ہے جو ابتدا ہی سے چلا آرہا ہے۔ بعد کے زمانوں میں انہوں نے ایک مصنف، ایک مفکر، ایک متکلم، ایک مفسّر اور ایک داعی کی حیثیت سے دنیا کے سامنے جو کچھ تفصیل اور دلیل کے ساتھ پیش کیا وہ کم از کم مجمل شکل میں ان کے ذہنِ رسا میں پہلے دن سے موجود تھا۔ ان کی نظر ابتدا ہی سے منزل آشنا تھی۔ و ذالک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء○

۴ رمارچ ۱۹۷۴ء (صدرالدین اصلاحی)

پہلا باب

مسلمانوں کا ذوقِ تبلیغ

جب سے بعض نومسلم قوموں میں ارتداد کی وبا پھیلی ہے ہندستان[1] کے مسلمانوں میں عام ہلچل پھیل گئی ہے اور ہر طرف سے تبلیغ و اشاعتِ اسلام کی آواز بلند ہونے لگی ہے۔ مختلف جماعتیں اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے کر اپنی بساط کے مطابق دعوتِ دین حق کی خدمت انجام دے رہی ہیں۔ اخبارات و رسائل میں اس کی اہمیت پر گرما گرم بحثیں جاری ہیں۔ وسائلِ تبلیغ کی تحقیق کے لیے مجلسیں منعقد ہو رہی ہیں اور فی الجملہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں درحقیقت کوئی ذوقِ تبلیغ پیدا ہوگیا ہے، لیکن جب ہم اس مسئلے پر غائر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم آج کل کے مسلمان اس ذوقِ تبلیغ سے بالکل ہی نا آشنا ہیں جو کسی زمانے میں اسلام کی فاتحانہ قوتوں کا ضامن اور اس کی عالمگیری اور جہاں کشائی کا سب سے زیادہ کارگر ہتھیار تھا۔ اگر آج ہمارے اندر وہی ذوق موجود ہوتا تو شاید ان کانفرنسوں اور مجلسوں کی ضرورت ہی پیش نہ آتی اور اغیار کی چیرہ دستیوں سے ہمارے گھر میں ماتم بپا ہونے کے بجائے خود اغیار کے مجمع میں ہمارے مذہب کی بڑھتی ہوئی قوت سے کھلبلی مچی ہوئی ہوتی۔ بعض وقت جب ہم غور کرتے ہیں کہ یہ اس مذہب کے پیرووں کی چیخ پکار ہے، جس کے عناصر ترکیبی میں دعوت الی الخیر اور تبلیغ دین الٰہی کا فرض ایک لازمی عنصر کی حیثیت سے شامل تھا، جس کے داعی نے اپنی ساری زندگی خدا کا آخری پیغام اس کے بندوں تک پہنچانے میں صرف کردی تھی اور جس کے مقدس پیرووں نے ایک صدی کے اندر اندر بحر الکاہل کے کناروں سے لے کر بحر اوقیانوس کے ساحل تک کلمۂ حق کی اشاعت کردی تھی تو ہم حیران ہو کر سوچنے لگتے ہیں کہ آیا یہ وہی مذہب ہے یا ہم مسلمانوں نے بنی اسرائیل کی طرح اپنے پیغمبروں کے بعد کوئی اور نیا مذہب بنا لیا ہے۔

---

(۱) غیر منقسم ہندستان مراد ہے (۱۹۲۵ء میں)

ہماری زبانوں پر تبلیغ تبلیغ کا وِرد جاری ہے اور ہم تبلیغ کے لیے انجمنیں بنا کر اسلام کی اشاعت کرنا چاہتے ہیں مگر شاید یہ اسلام کی تاریخ میں پہلا واقعہ ہے کہ اس کے پیروؤں نے عیسائیوں کی طرح مشنری سوسائٹیاں بنانے کی کوشش کی ہے۔ یا اس بے تابی کے ساتھ تبلیغ کا شور مچایا ہے۔ اگر کامیابی کا حقیقی راز صرف انجمن سازیوں اور شوروشغب میں ہوتا تو یقیناً ہماری ترقی کی رفتار ہمارے اسلاف سے زیادہ تیز ہونی چاہیے تھی۔ لیکن اس کے برخلاف ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس ساز وسامان کو لے کر ہمارا ہر قدم پیچھے اٹھ رہا ہے اور اُس بے سامانی کے عالم میں ہمارے اسلاف کی کامیابیوں کا یہ عالم تھا کہ ان کی بدولت آج دنیا کے گوشے گوشے میں اسلام کے پیرو موجود ہیں اور خود ہندستان میں ہماری تعداد[1] سات کروڑ تک پہنچی ہوئی ہے۔ پھر آخر سوچنا تو چاہیے کہ ہم میں کس چیز کی کمی ہے اور اشاعت اسلام کا اصلی راز کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ آج یہ جتنی کم زوریاں مسلمانوں میں پیدا ہوگئی ہیں سب صرف اس لیے ہیں کہ ان میں سے اسلامی روح نکل گئی ہے اور وہ بھول گئے ہیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے وہ کیا ہیں۔ اگر وہ اسلام کو سمجھ لیں اور انہیں معلوم ہو جائے کہ ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد اور اس کا نصب العین کیا ہوتا ہے تو یہ تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا مسئلہ خود بہ خود حل ہو جائے گا۔

مسلمان کا مقصدِ وجود

پروفیسر میکس مُلّر (Max Muller) کے بقول اسلام دراصل ایک تبلیغی مذہب ہے، جس نے اپنے آپ کو تبلیغ کی بنیادوں پر قائم کیا، اسی کی قوت سے ترقی کی اور اسی پر اس کی زندگی کا انحصار ہے۔ اسلامی تعلیمات پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اگر کسی چیز کا نام ہے تو وہ صرف دعوتِ حق ہے، اور مسلمان کی زندگی کا اگر کوئی مقصد ہے تو وہ صرف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ قرآن حکیم میں مسلمان کا مقصد حیات یہ بیان کیا گیا ہے:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ط (آل عمران:۱۱۰)

”دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔“

---

(۱) یہ ۱۹۲۵ کی بات ہے۔ (اور اب ۲۰۰۱ء میں تقریباً ۱۳۸، ۱۸۸، ۲۴۰ کروڑ تک یہ تعداد پہنچ چکی ہے۔)

اور دنیا کے لیے اس کے وجود کی ضرورت صرف یہ ظاہر کی گئی ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ (آل عمران:۱۰۴)

''تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی رہنے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔''

اسے جگہ جگہ حکم دیا گیا ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (النحل:۱۲۵)

''اے نبیؐ! اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو، حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ۔''

اور: فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ۠ (قٓ:۴۵)

''پس تم قرآن کے ذریعے سے ہر اُس شخص کو نصیحت کرو جو میری تنبیہ سے ڈرے۔''

اور: فَذَكِّرْ ۟ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ؕ (الغاشیہ:۲۱)

''اے نبیؐ! نصیحت کیے جاؤ بس تم نصیحت ہی کرنے والے ہو۔''

یہی تعلیم تھی کہ جس کا اثر رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی زندگی پر سب سے زیادہ غالب تھا اور اسی نے حضرات صحابۂ کرامؓ کی زندگیوں کو بالکل بدل دیا تھا۔ ان کی مقدس زندگیاں عبارت تھیں صرف دعوت و تبلیغ سے۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، غرض ہر کام اپنے اندر یہ معنوی مقصد پوشیدہ رکھتا تھا کہ خدا کی طرف لوگوں کو بلائیں اور اللہ کے بندوں کو صراط مستقیم پر چلنے کی تلقین کریں۔

جب تک مسلمانوں میں قرآن حکیم اور اسوۂ رسولؐ کی ان تعلیمات کا اثر باقی رہا اس وقت تک ہر مسلمان کی زندگی ایک مبلغ اور داعی کی سی زندگی رہی۔ انہوں نے صنعت تجارت، زراعت، حکومت اور دنیا کے سارے کام کیے مگر دل میں یہ لگن رہی کہ اسلام کی جو نعمت خدا نے ان کو عطا کی ہے اس سے تمام بنی نوع انسان کو بہرہ مند کرنے کی کوشش کریں۔ وہ حقیقتاً اسلام کو دنیا کے لیے بہترین نعمت سمجھتے تھے اور اس لیے ان کا ایمان تھا کہ ہر انسان تک اس نعمت کو پہنچانا ان کا فرض ہے۔ جو شخص جس حال میں تھا اسی حال میں وہ یہ فرض انجام دیتا تھا۔ تاجروں نے تجارت کے کام میں، مسافروں نے اپنے سفر کے دوران میں، قیدیوں نے اپنے قید خانوں میں، ملازموں نے اپنے دفتروں میں اور مزارعوں نے اپنے کھیتوں میں یہ مقدس خدمت انجام دی۔ اور یہ ذوق اس حد تک ترقی کر گیا کہ عورتوں تک نے نہایت مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ اسلام کی تبلیغ کی۔

اسلام کی قوت کا اصل سرچشمہ

یہی ذوق حقیقتاً اسلام کی قوت کا اصل سرچشمہ تھا۔ آج جو دنیا میں چالیس کروڑ مسلمان[1] نظر آرہے ہیں اور دنیا کی مختلف نسلوں، مختلف قوموں، اور مختلف ملکوں پر اسلام کی حکومت قائم ہے وہ صرف اسی ذوق تبلیغ کا نتیجہ ہے۔

اسلام کے دشمن کہتے ہیں کہ اس کی اشاعت صرف تلوار کی رہین منت ہے لیکن تاریخ شاہد ہے کہ وہ صرف تبلیغ کی منت پذیر ہے۔ اگر اس کی زندگی تلوار پر ہی منحصر ہوتی تو وہ تلوار ہی سے فنا بھی ہو جاتی۔ اور اب تک تلوار سے اس پر جتنے حملے ہوئے ہیں وہ اسے فنا کر دینے میں قطعاً کامیاب ہو جاتے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر اوقات اس نے تلوار سے مغلوب ہو کر تبلیغ سے فتح حاصل کی۔ ایک طرف بغداد میں قتل عام جاری تھا اور دوسری طرف سماترا میں اسلام کی حکومت قائم ہو رہی تھی۔ ایک طرف قرطبہ (اندلس) سے اسلام مٹایا جا رہا تھا اور دوسری طرف جاوا میں اس کو ایک نئی زندگی حاصل ہو رہی تھی۔ ایک طرف تاتاری اس کے گلے پر چھری پھیر رہے تھے اور دوسری طرف وہ خود ان کے دلوں کو فتح کر رہا تھا۔ ایک طرف ترک اسے غلامی کا طوق پہنا رہے تھے اور دوسری طرف خود ان کے دل اپنے آپ کو اس کی غلامی کے لیے پیش کر رہے تھے۔

اگر یہ اس کی تبلیغ کی فتح نہیں تھی تو اور کیا تھی؟ آج اسلام کی وہ فتوحات جنھیں شمشیری فتوحات کہا جا سکتا ہے دنیا سے مٹ چکی ہیں۔ اسپین فنا ہو چکا، صقلیہ مٹ گیا، یونان تباہ ہو گیا مگر وسط افریقہ، جاوا، سماترا، چین اور جزائر ملایا جنہیں اس نے تبلیغ کے ہتھیار سے فتح کیا ہے بدستور موجود ہیں اور اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ اسلام کی زندگی تبلیغ اور صرف تبلیغ پر منحصر ہے۔ پھر کیا یہ تبلیغ مشنری سوسائٹیوں کے ذریعے کی گئی تھی؟ کیا یہ عظیم الشان فتوحات اسی بے عمل چیخ پکار کے ذریعے حاصل ہوئی تھی، جس میں آج ہم مشغول ہیں؟ کیا یہ عالمگیریاں ان رسالہ بازیوں، ان کاغذی لڑائیوں اور ان قلمی ترک تازیوں کی منّت کش ہیں جنہیں ہم نے مسیحی مبلّغین کی تقلید میں اختیار کیا ہے۔ تاریخ اس کا جواب نفی میں دیتی ہے۔ اس مضمون میں ہم اسی مسئلہ پر بحث کرنا چاہتے ہیں۔

---

(۱) یہ اندازہ ۱۹۲۵ء کا ہے۔ اب تو دنیا میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً دوگنی ہو چکی ہے۔ (اور اب یہ تعداد ایک ارب سے بھی متجاوز ہو چکی ہے۔ ۸۳ء)

دوسرا باب

اشاعتِ اسلام کے اسباب

اگر واقعات وحقائق کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی اشاعت میں تین چیزیں لازمی عنصر کی حیثیت سے شریک ہیں:

ایک اس کے سادہ عقائد اور دلکش عبادات۔ دوسرے مسلمانوں کی زندگی میں اس کی تعلیم کے حیرت انگیز نتائج۔ اور تیسرے مسلمانوں کا ذوق تبلیغ۔

پہلی چیز عقل سے اپیل کرتی ہے، دوسری جذبات کو ابھارتی ہے اور تیسری ایک مشفق رہ نما کی طرح بھولے بھٹکوں کو راہ راست پر لگاتی ہے۔ جس طرح بازار میں ایک متاع کی قبولیت کے لیے صرف اس کی ذاتی خوبی ہی ضمانت نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے ایسے کارکنوں کی ضرورت بھی ہوتی ہے جو اس کی خوبیاں اور فوائد لوگوں کے ذہن نشین کرائیں اور ایسے شاہد بھی درکار ہوتے ہیں جو اپنے اندر اس کے منافع کی عملی شہادت دیں۔ اسی طرح دنیا میں اسلام کی اشاعت کے لیے بھی ان تینوں چیزوں کے مساویانہ اشتراک عمل کی ضرورت رہی ہے اور جب کبھی اس میں کسی ایک کی کمی رہ گئی ہے تو ضرور اشاعتِ اسلام کی تیز رفتاری پر بھی اس کا اثر پڑا ہے۔ یہ تینوں چیزیں کس طرح اپنا عمل کرتی ہیں اور ان کے اشتراکِ عمل سے کیا نتائج رونما ہوئے ہیں، اس کو جاننے کے لیے ذرا تشریح کی ضرورت ہے۔

اسلامی عقائد کی سادگی اور فطرت سے ہم آہنگی

اسلامی عقائد اس قدر سادہ اور دل نشین ہیں کہ ایک معمولی سے معمولی عقل کا انسان بھی انہیں تسلیم کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ نہ ان کے اندر کسی قسم کی پیچ در پیچ فلسفیت ہے،

نہ ان میں کسی قسم کے ظن و اوہام سے کام لیا گیا ہے، نہ ان کے اندر دوراز کار باتوں کو دخل ہے۔ چند نہایت صاف اور سیدھے سے اصول ہیں جنہیں عقل نہایت آسانی سے قبول کر لیتی ہے اور جنہیں قبول کر لینے کے بعد انسان کو اپنے اندر خود ایک حیرت انگیز انقلاب محسوس ہونے لگتا ہے۔ ان سب باتوں کے ساتھ ان کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر چیز نہایت صاف اور قطعی ہے، جس کے اندر کسی قسم کے احتمالات نہیں ہیں۔ خدا کے متعلق اس نے بالکل واضح عقیدہ پیش کیا ہے:

اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (الانبیاء:۱۰۸)

''یعنی تمہارا خدا وہی ایک خدا ہے۔''

اس میں دوئی کا ہرگز احتمال نہیں ہے:

لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ (النحل:۵۱) ''دو خدا نہ بنالو۔''

اور اس کے لیے کسی مددگار کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ:

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (البقرہ:۲۰) ''وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

وَ يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ (ابراہیم:۲۷) ''اللہ کو اختیار ہے کہ جو چاہے کرے۔''

يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ (المائدہ:۱) ''بے شک اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔''

لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ

(الاخلاص:۳،۴)

''اس کی ذات، والدین اور ولدیت سے بھی مبرّا ہے اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔''

اسے کسی قسم کے انسانی عوارض لاحق نہیں ہوتے:

اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (البقرہ:۲۵۵)

''وہ زندۂ جاوید ہستی جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔ وہ نہ سوتا ہے اور نہ اُسے اونگھ لگتی ہے۔''

آسمان اور زمین میں اس کے سوا کوئی قوت ایسی نہیں ہے، جس سے انسان استمداد اور

استعانت کر سکتا ہو:

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ○ (البقرہ:۱۰۷)

''کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی (اللہ) کی ہے۔ اس کے سوا نہ تو تمہارا کوئی کارساز ہے اور نہ کوئی مددگار۔''

وہی اس قابل ہے کہ اس کی عبادت کی جائے:

فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ○ؕ (الزمر:۲)

''تو اللہ کی بندگی کرو خالصتاً اس کی پیروی کرتے ہوئے۔''

اسی طرح رسالت کے متعلق بھی اس نے کسی قسم کی الوہیت کا شبہ باقی نہیں رکھا ہے۔ اور نہایت صفائی کے ساتھ یہ عقیدہ پیش کیا ہے کہ رسول ایک انسان کے سوا کچھ نہیں ہوتا جسے خدا نے اپنے بندوں تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے منتخب فرمالیا ہے:

اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ (الکہف:۱۱۰)

''میں تو ایک انسان ہوں تم ہی جیسا، میری طرف وحی کی جاتی ہے۔''

وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ○ؑ (الرعد:۷)

''اور ہر قوم کے لیے خدا نے ایک ہادی بھیجا ہے۔''

اعمال اور ان کی ذمے داری کے متعلق اس نے پوری صفائی کے ساتھ متنبہ کیا ہے کہ یہاں کوئی کفارہ اور بدل نہیں ہے:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ○ؕ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ○ؑ (الزلزال:۷،۸)

''ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمے دار ہے اور جو شخص جیسے اعمال کرے گا اسے ویسی ہی جزا یا سزا ملے گی۔''

معاد کے متعلق اس نے ایسا صاف اور واضح عقیدہ پیش کیا ہے کہ کسی مذہب نے بھی نہیں کیا۔ نہ اس میں بدھ مذہب کا بعید از عقل فلسفۂ نجات ہے، نہ ویدک دھرم کا پیچ در پیچ فلسفۂ تناسخ اور نہ دہریت کا عقیدۂ فنائے کامل۔ بلکہ اس میں نہایت وضاحت کے ساتھ یہ عقیدہ پیش کیا گیا ہے کہ انسان اپنی موجودہ زندگی کے اعمال کا نتیجہ اپنی آئندہ زندگی میں دیکھے گا اور اصلی زندگی وہی ہوگی۔

یہ عقائد اس قدر سیدھے سادے ہیں کہ انسانی عقل انہیں آسانی کے ساتھ قبول کر لیتی ہے اور اسلامی مبلغین کو ہمیشہ اپنی تبلیغ میں اس لیے کامیابی ہوتی ہے کہ وہ کوئی ایسی پیچیدہ چیز پیش نہیں کرتے جسے تسلیم کرنے سے عقل اباء کرتی ہو۔ ایک مشہور فرانسیسی عالم پروفیسر مانٹیٹ ان عقائد کے متعلق لکھتا ہے:

> ''ایسا عقیدہ جو اس قدر واضح، فلسفیانہ پیچیدگیوں سے اس قدر مبرّا اور اس قدر معمولی عقل میں آجانے کے قابل ہو، اس میں یقیناً انسانی نفس کو مسخر کر لینے کی معجز نما قوت ہونی چاہیے اور فی الواقع وہ ایسی قوت رکھتا ہے۔''

انسانی عقل پر ان عقائد کا جتنا گہرا اثر ہوتا ہے اس کا اندازہ نہایت آسانی کے ساتھ اس واقعے سے ہوسکتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک یورپین سیاح افریقہ کی گالا قوم کے ایک آزاد شدہ غلام سے ملا جسے بچپن میں ساحلِ زنج سے پکڑ کر جدّہ میں فروخت کر دیا گیا تھا۔ سیّاح نے اس سے پوچھا کہ کیا تمہارے دل میں ان لوگوں کے لیے کوئی نفرت نہیں ہے جنہوں نے تم کو بلا کسی حق کے پکڑ کر جانوروں کی طرح فروخت کر دیا؟ اس کے جواب میں اس حبشی غلام نے کہا:

> ''ہاں میرے دل میں طبعاً ان کی طرف سے رنج موجود ہے مگر ایک چیز نے اس کی تلافی کر دی ہے، اور وہ یہ ہے کہ میں ان کی بدولت کفر کی جہالت سے نکل گیا ہوں۔ میں اسے خدا کا فضل و کرم سمجھتا ہوں کہ میں اس ملک میں لایا گیا اور مجھے اسلام کی نعمت حاصل ہوئی۔ یقین کیجیے کہ ایمان کی حلاوت سے بڑھ کر کوئی حلاوت نہیں ہے اور یہ ایسی حلاوت ہے جسے صرف دل ہی محسوس کرتا ہے، زبان سے اس کا بیان ممکن نہیں۔''

اسلامی عبادات کی دلکشی اور جاذبیت

یہی حال اسلامی عبادات کا ہے۔ ان میں کچھ ایسی دلکشی اور جاذبیت بھری ہوئی ہے کہ مانٹیسکیو کے بقول کوئی دل ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سعید بن حسن اسکندریہ کے ایک یہودی نے لکھا ہے:

> ''میں محض مسلمانوں کی عبادت کو دیکھ کر مسلمان ہوا ہوں۔ ایک دفعہ میں جامع مسجد میں نماز کا منظر دیکھنے گیا۔ سب سے پہلے جس چیز نے میرے دل پر اثر کیا وہ خطبہ تھا۔ اس کا ایک ایک لفظ میرے دل پر اثر کر رہا تھا اور خصوصاً جب خطیب نے کہا: اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَ اِيْتَآءِ ذِى الْقُرْبٰى وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ (النحل:۹۰)'' اللہ عدل اور احسان اور صلۂ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے۔'' تو میرے دل میں ایسے مذہب کی بے حد عزت قائم ہوگئی، جس کا خدا اتنی اعلیٰ تعلیم دیتا ہو۔ پھر جب نماز شروع ہوئی اور مسلمان پَرے کے پَرے باندھ کر کھڑے ہوئے تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ یہ فرشتے ہیں جن کے سامنے خدا بے نقاب ہو کر آ گیا ہے اور میرے دل نے کہا کہ اگر خدا نے دو مرتبہ بنی اسرائیل سے کلام کیا تھا تو اس قوم کے ساتھ وہ روزانہ کلام کیا کرتا ہے۔''

نماز کی یہ شان کہ اُس کے لیے نہ کسی پروہت کی قید ہے نہ پادری کی۔ نہ کسی مندر کی شرط ہے نہ گرجا کی۔ ہر مسلمان امام بن سکتا ہے۔ ہر جگہ اس کی مسجد ہے اور ہر شخص بلا امتیازِ درجہ و قومیت اس میں شریک ہو سکتا ہے۔ نماز اس قدر تاثیر اپنے اندر رکھتی ہے کہ متعصب سے متعصب دشمنانِ اسلام بھی اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایک ان دیکھے خدا کی عبادت اس انداز کے ساتھ کہ محض اس کے ذہنی تصوّر سے دلوں پر خشوع و خضوع طاری ہے اور تمام حرکات و سکنات سے انتہائی عظمت و خوف کے آثار نمایاں ہیں، پتھر سے پتھر دل کو بھی موم کر دیتی ہے۔ پادری لیفرائے، جس سے علمائے ہند کے معرکۃ الآرا مناظرے شاید ابھی تک لوگوں کی یاد میں محفوظ ہوں، اپنی کتاب Mankind And Church میں لکھتا ہے:

"کوئی شخص مسلمانوں کی اس عبادت کو دیکھ کر اس کے اثر سے مغلوب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ مسلمان خواہ کہیں ہو، سڑک پر چل رہا ہو، ریلوے اسٹیشن پر ہو، دوکان پر بیٹھا ہو یا میدان میں ٹہل رہا ہو، اذان ہوتے ہی سب کام چھوڑ دیتا ہے اور ایک خدا کے آگے جھک جاتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ جس شخص نے دہلی کی جامع مسجد میں الوداع کے دن پندرہ بیس ہزار مسلمانوں کو نہایت خاموشی اور خشوع و خضوع کے ساتھ دیکھا ہو وہ اس منظر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور اس کے دل میں اس قوت کا احساس ضرور پیدا ہوتا ہے جو اس مذہبی نظام میں کام کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی روزانہ پنج وقتہ نماز کی باقاعدگی اور انتہائی شور وغل کے اوقات میں بھی ان کا سکون اور اطمینان سے اپنا فرض ادا کرنا اپنے اندر ایک خاص پیغام رکھتا ہے۔"

اسلامی تعلیمات کے اثرات مسلمانوں کی زندگی پر

عقائد وعبادات کے بعد دوسری چیز جو اپنی عملی تاثیر کے اعتبار سے اسلام کی اشاعت میں سب سے زیادہ کارگر قوت ہے وہ مسلمانوں کی اسلامی زندگی ہے۔ اسلام اگر صرف اصول ہی پیش کرتا اور اس کی تعلیمات میں وہ انقلاب انگیزیاں نہ ہوتیں جنہوں نے وحشی سے وحشی قوموں کو بھی انسانیت کے اعلیٰ مدارج تک پہنچا دیا تو شاید دنیا اس کی طرف بہت کم مائل ہوتی لیکن اس نے اصول کے ساتھ اعمال بھی پیش کیے ہیں اور فی الحقیقت یہ انہی کی مقناطیسی قوت ہے جو دلوں کو اس طرف کھینچتی ہے۔

خدا کی وحدانیت، اس کی قدرت اور صرف اسی کی سزاوارِ استعانت ہونے کے متعلق اسلام کی تعلیمات نے مسلمانوں کو اس قدر خوددار، اس قدر صابر وشاکر اور اس قدر متحمل و مستقل مزاج بنا دیا ہے کہ وہ نہ کسی سے دنیا میں ڈرتے ہیں، نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں اور نہ کسی بڑی سے بڑی مصیبت کے مقابلے میں مایوس ہوتے ہیں۔ جزا وسزا اور یوم آخر کے متعلق اسلام کی تعلیم نے ان کے اندر اتنی شجاعت وبہادری پیدا کر دی ہے کہ وہ اپنی موجودہ زندگی کو فانی سمجھ کر ہر وقت اسے خدا کے نام پر قربان کر دینے کے لیے تیار رہتے ہیں اور ان کے خون کی حرارت دنیا

میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ پرہیزگاری اور ارتقاء کے متعلق اسلامی تعلیمات نے ان کے اندر غیر معمولی زہد وتقویٰ پیدا کر دیا ہے، اور شراب، چوری اور اخلاقی جرائم سے احتراز کرنے میں وہ تمام مذاہب کے پیروؤں سے بڑھے ہوئے ہیں۔ انسانی مساوات اور اسلامی اخوت کے متعلق اسلام کی تعلیم نے ان کے اندر ایسی جمہوری روح پھونک دی ہے کہ نہ ان کے ہاں نسل و رنگ کا امتیاز ہے نہ ذات پات کی قید، نہ امیر غریب کا فرق اور نہ قومیت و وطنیت کا تعصب۔ ہر شخص اسلام قبول کر لینے کے بعد اسلامی برادری کا ایک رکن بن جاتا ہے خواہ وہ کالا ہو یا گورا، امیر ہو یا غریب، آقا ہو یا غلام، بہر حال مسلمان اس کو اپنا بھائی سمجھنے پر مجبور ہیں اور وہ نماز میں بڑے سے بڑے مسلمان کے برابر کھڑے ہونے کا حق رکھتا ہے۔

اس کے علاوہ مسلمانوں کی زندگی میں دوسری اسلامی تعلیمات کے اثرات بھی نہایت نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ علم اور تہذیب وتمدن ہے جو اسلام قبول کرتے ہی وحشی سے وحشی قوموں میں گھر کر لیتا ہے۔ یورپ کے مسیحی مبلغین یہ دیکھ کر حیران رہ گئے ہیں کہ افریقہ کی وحشی سے وحشی قوموں میں اسلام کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ مدنیت کے آثار بھی پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مساجد کی تعمیر، مدارس کا قیام، اجتماعی زندگی اور اس کے ساتھ تجارت اور خوش حالی کی ترقی، یہ ایسی چیزیں ہیں جو رفتہ رفتہ اسلام کی اشاعت کے ساتھ افریقہ کی وحشیانہ زندگی کو تمدن و حضارت سے بدل دیتی ہیں اور انہیں دیکھ کر دوسری وحشی قوموں کو بھی وہی مذہب قبول کر لینے کی خواہش ہوتی ہے جو ان کے ہم جنسوں کو اتنی جلدی اتنے بلند درجے پر پہنچا دیتا ہے۔ تاریخوں میں یہ واقعہ مشہور ہے کہ چھٹی صدی ہجری میں جب بالائی نائیجیریا کی سب سے زیادہ طاقت ور ریاست جنی Jenne میں بربروں نے اسلام کی اشاعت شروع کی تو وہاں نہایت کثرت سے علماء فضلاء پیدا ہو گئے اور جب بادشاہ نے اسلام قبول کرنے کے لیے ایک مجلس مقرر کی تو اس میں دو ہزار چار سو علماء شریک ہوئے۔ اسلام کے ان مدنیت پرور اثرات نے عرب، ہندستان مصر اور اسپین (اندلس) میں جو حیرت انگیز نقوش چھوڑے ہیں ان کے بیان کی یہاں ضرورت نہیں۔ تاریخ وآثار کی ان پر نہایت روشن شہادت موجود ہے۔

اسلامی مساوات کی اثر انگیزی

اسلامی زندگی میں سب سے زیادہ مؤثر چیز مساوات ہے۔ وہ تمام ان قوموں کے لیے ایک آسمانی رحمت ہے۔ جنہیں رسم ورواج اور طاقت واقتدار کی خودغرضی نے انسانیت کی عام سطح سے نیچے رہنے پر مجبور کردیا ہے۔ اسلام ان کے لیے پیغام نجات کا حکم رکھتا ہے اور زمانہ شاہد ہے کہ اس نے ایسی ہزاروں قوموں کو قعرِ مذلّت سے اٹھا کر آسمان عزّت وشرافت تک پہنچادیا ہے۔ اس شان مساوات نے اسلام کی اشاعت میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے اور تقریباً تمام ان علاقوں میں جہاں ایسی مظلوم قومیں رہتی ہیں، اسلام کی مقبولیت کا واحد ذریعہ یہی چیز ہے۔ سرولیم ہنٹر (Sir William Hunter) بنگال کی نیچ ذات قوموں میں اشاعتِ اسلام کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''ان غریب مچھیروں، شکاریوں اور نیچ ذات کسانوں کے لیے اسلام ایک آسمانی رحمت بن کرنازل ہوا۔ وہ نہ صرف حکمراں قوم کا مذہب تھا بلکہ اس میں اتنی مساوات بھی تھی کہ وہ اس کی بدولت خود ان لوگوں سے بھی زیادہ بلند درجہ حاصل کرسکتے تھے جو انہیں ذلیل خیال کرتے تھے اس بنا پر اسلام ملک کے سب سے زیادہ خوش حال صوبہ پر قابض ہوگیا۔ اگرچہ تاریخ میں کہیں کہیں جبریہ اشاعتِ اسلام کی مثالیں بھی ملتی ہیں مگر دراصل قوت وہ چیز نہیں ہے جس کا اسلام ممنون ہے، بلکہ وہ خود اس کی خوبیاں ہیں۔ اس نے اہل بنگال کی عقل کو اپیل کیا، ان کے سامنے انسانیت کا ایک بلند مفہوم پیش کیا۔ انسانی برادری کا ایک ایسا عجیب اصول قائم کیا جس سے وہ بالکل ناآشنا تھے اور ذات پات کی قیدوں کو بالکل توڑ دیا۔''

جنوبی ہند میں زیادہ تر اسی مساوات کی بدولت اسلام نے ہندویت پر فتح پائی ہے۔ آج سے بیس پچیس سال پہلے ٹِناویلی کے علاقہ میں جو واقعہ پیش آیا تھا وہ اس فتح کا ایک سبق آموز نمونہ ہے۔ اس علاقے میں شنار نامی ایک قوم رہتی ہے، جس کا شمار نیچ قوموں میں ہوتا تھا۔ اپنی ہنرمندی اور مستعدی کی بدولت اس نے کافی دولت پیدا کی اور تعلیم ومعاشرت کے اعتبار سے عام ہندوؤں کے مقابلے میں اس کا درجہ بہت بلند ہوگیا مگر پھر بھی ہندو اس کے ساتھ وہی اہانت آمیز سلوک کرتے رہے جو اچھوتوں کے ساتھ وہ عام طور پر کرتے ہیں۔ اس سے شناروں

کے جذبات کو سخت صدمہ پہنچتا تھا اور ان کے دل ہندو مذہب سے پھرتے جاتے تھے۔ آخر ایک مرتبہ ہندوؤں سے ان کی سخت جنگ ہوئی اور محض چند شناروں کے ایک مندر میں گھس جانے پر ہندوؤں نے ان کو سخت زدوکوب کیا۔ اس پر تمام شناروں نے مسلمان ہو جانے کا فیصلہ کرلیا۔ تقریباً چھ سو شنار اسی تاریخ کو مسلمان ہو گئے اور جوں جوں آس پاس کے دیہات میں اس واقعہ کی اطلاع پہنچتی گئی شنار ذات کے لوگ اسلام قبول کرتے چلے گئے۔

افریقہ کے حبشیوں میں بھی یہی انسانی مساوات اور اسلامی اخوّت اشاعت اسلام کی سب سے زیادہ مؤثر قوت ہے۔ مسٹر بلائیڈن اپنی کتاب ''عیسائیت، اسلام اور نیگرو نسل'' (Christianity Islam And Negro Race) میں لکھتے ہیں:

> ''جوں ہی کسی بت پرست حبشی کے متعلق پیروانِ محمدؐ کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلام لانے کا ارادہ رکھتا ہے تو خواہ کتنا ہی وحشی اور ادنیٰ درجے کا آدمی کیوں نہ ہو اسے فوراً اپنی برادری میں ایک برابر کے رکن کی حیثیت سے شامل کرلیا جاتا ہے اور محض تالیف قلبی ہی کے لیے نہیں بلکہ حقیقتاً بھائی سمجھ کر اس کی اتنی خاطر مدارات کی جاتی ہے کہ وہ بہت جلدی اپنے لیے اسلام کی غیر معمولی نعمتوں کو محسوس کر لیتا ہے۔ افریقہ میں اسلام کو عیسائیت پر جو تفوق حاصل ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔''

تیسرا باب

مبلغینِ اسلام کی خدماتِ جلیلہ

گزشتہ صفحات میں اشاعتِ اسلام کے دو اہم اسباب سے بحث کی جا چکی ہے۔ اب اس کے عملی پہلو پر نظر ڈال کر دیکھنا چاہیے کہ اس آسمانی صداقت پر ایمان لانے والوں نے اس کی روشنیوں کو اقطاعِ عالم میں پھیلانے کے لیے کیا کیا کوششیں کی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اصل چیز تو وہی اسلام کی ذاتی خوبیاں اور عملی محاسن ہیں جو ہر قلبِ سلیم سے اس کو ایک سچا دین قبول کرا لیتی ہیں۔ لیکن دنیا کے مشاہدہ میں ہم رات دن دیکھتے ہیں کہ اچھی سے اچھی متاع بھی، اگر اس کا اشتہار نہ ہو تو رکھی رہ جاتی ہے اور بیچنے والے مستعد کارکن (Agents) بُری سے بُری متاع کے خریدار بھی بازار میں پیدا کر لیتے ہیں۔ جب تک کسی چیز کے اوصاف اور منافع کو لوگوں تک پہنچایا نہ جائے اور دلوں میں اس کے لیے شوق پیدا نہ کیا جائے اس وقت تک خاص خاص طبائع کے سوا عام طبیعتیں اس کی طرف کم رجوع کرتی ہیں، اور اسی لیے ہر متاع کی کامیابی عموماً اس کے سوداگروں کی سرگرمی، مستعدی اور قوتِ تشہیر پر منحصر ہوا کرتی ہے۔ یہی اصول مذاہب کی اشاعت پر بھی یکساں حاوی ہے۔ اسلام خواہ کتنا ہی سچا اور بہتر مذہب ہو مگر اس کی اشاعت کے لیے صرف اس کی ذاتی خوبیاں ہی کافی نہیں ہو سکتیں بلکہ اس کے پیروؤں کا ذوقِ تبلیغ بھی ضروری ہے۔ بلکہ زیادہ صحیح طور پر یہ ذوقِ تبلیغ اشاعتِ اسلام کے ارکانِ ثلاثہ میں عملی رکن کی حیثیت رکھتا ہے۔

مسلمانوں کے ذوقِ تبلیغ کی جہاں گیری

آج ہم بے عمل مسلمان اس حیرت انگیز ذوقِ تبلیغ کا ٹھیک ٹھیک تصوّر بھی نہیں کر سکتے جو گزشتہ زمانے کے دین دار مسلمانوں میں کام کر رہا تھا۔ اور جو ہمارے موجودہ زمانے میں بھی

افریقہ، چین(۱) اور جزائر ملایا کے مسلمانوں میں کام کر رہا ہے۔ ان لوگوں کے وظائفِ حیات میں سب سے زیادہ اہم وظیفہ اگر کوئی تھا تو وہ صرف اس دین کی صداقت کو بنی نوعِ انسان کے زیادہ سے زیادہ افراد تک پہنچانا تھا جس کی روشنی سے ان کے دل معمور تھے۔ ان کے دلوں پر یہ عقیدہ پتھر کی لکیر بنا ہوا تھا کہ مسلمان کی حیثیت سے ان کی پیدائش کا مقصد صرف دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ وہ جہاں جاتے تھے یہ مقصد ان کے ساتھ جاتا تھا۔ اور ان کی زندگی کے ہر عمل میں اس کی شرکت لازمی تھی۔ وہ قریش کے مظالم سے بھاگ کر حبشہ گئے تو وہاں بھی انہوں نے صرف یہی کام کیا۔ اُنہیں مکّہ سے نکل کر مدینہ میں امن کی زندگی نصیب ہوئی تو اپنی تمام قوّت انہوں نے اسی تبلیغ دین الٰہی میں صرف کر دی۔ ان کو ساسانی اور رومانی تہذیبوں کے بوسیدہ قصر گرا دینے کی خدمت عطا کی گئی تو شام و عراق اور ایران و روم میں بھی انہوں نے صرف یہی مقدّس فرض انجام دیا۔ انہیں خدا نے زمین کی خلافت عطا فرمائی تو اس سے بھی انہوں نے عیش پرستی نہیں کی بلکہ وہ اللہ کے دین کی اشاعت کرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ایک طرف اوقیانوس کی طوفانی موجوں نے انہیں روک دیا اور دوسری طرف چین کی سنگین دیوار ان کے راستے میں حائل ہوگئی۔ وہ اپنے تجارت کے مال لے کر نکلے تو اس میں بھی ان کے دلوں پر یہی خواہش چھائی رہی اور انہوں نے افریقہ کے تپتے ہوئے ریگستانوں میں، ہندستان کی سرسبز وادیوں میں، بحر الکاہل کے دور افتادہ جزیروں میں اور یورپ کے سپید رنگ کفر زاروں میں ملّت حنیفی کی روشنیوں کو پھیلا دیا۔

یہ ذوقِ تبلیغ یہاں تک ترقی کر گیا تھا کہ قید خانوں کی کڑی سے کڑی مصیبتیں جھیلتے وقت بھی ان کے دلوں سے اس کی لذت محو نہیں ہوتی تھی۔ وہ اندھیری کوٹھریوں میں اپنے اصحاب سجن کو بھی اسلام کی تبلیغ کرتے تھے اور حد یہ ہے کہ دار پر بھی اگر انہیں کسی چیز کی تمنا ستاتی تھی تو وہ صرف یہی تھی کہ اپنے آخری لمحات زندگی کو اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچانے میں صرف کر دیں۔

بیلجیمن کانگو کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ جب حکومتِ بلجیم نے وہاں کے ایک مسلمان امیر کو گرفتار کر کے سزائے موت کا حکم سنا دیا تو اس نے دنیا سے چلتے چلتے خود اس پادری کو بھی مسلمان کر لیا جو اسے مسیحیت کا پیغام نجات دینے گیا تھا۔

---

(۱) یہ اس زمانے کی بات ہے جب چین پر کمیونسٹوں کا قبضہ نہ ہوا تھا۔

حضرت سیّد مجدّد احمد سرہندیؒ کے متعلق کتبِ سیَر میں لکھا ہے کہ جہانگیر کی قید میں دو سال کا زمانہ انہوں نے محض فریضۂ تبلیغ کی انجام دہی میں گزارا اور جب رہا ہوئے تو کئی سو ہندو قیدی ان کی برکت سے دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ ہمارے موجودہ زمانے میں بھی مولانا محمد جعفر تھانیسری نے، جو مجاہدین سرحد سے ساز باز رکھنے کے الزام میں کالے پانی بھیجے گئے تھے، انڈمان کے بہت سے قیدیوں کو مسلمان کرلیا تھا۔ مشرقی یورپ میں تو اسلام کی اشاعت تنہا ایک مسلمان عالم کی کوششوں کا نتیجہ تھی جو نصاریٰ سے جہاد کرتا ہوا گرفتار ہو گیا تھا۔ قید کی حالت میں وہ پابہ زنجیر ڈان اور ڈینیوب کے درمیانی علاقے میں بھیج دیا گیا اور وہاں اس کے خلوص قلب کی روشنی اس قدر پھیلی کہ تھوڑے عرصہ میں بارہ ہزار آدمی مسلمان ہو گئے۔ اور چھٹی صدی ہجری کے وسط میں تقریباً سارا علاقہ اسلام کی برکات سے معمور ہو گیا۔

مسلمان خواتین کا ذوقِ تبلیغ

اس عالمگیر ذوق سے مسلمانوں کی عورتیں بھی خالی نہ تھیں۔ تاتاری مغلوں سے جن ہاتھوں نے مسلم کشی کی تلوار چھین کر اسلام کی اطاعت کا طوق پہنایا تھا وہ انہی ضعیف اور نازک عورتوں کے ہاتھ تھے جنہیں یہ لوگ ممالک اسلامیہ سے لونڈیاں بنا کر لے گئے تھے۔ غازان شاہ کے بھائی اولجاتیو خاں کو اس کی بیوی ہی نے مسلمان کیا تھا۔ اور اسی کی بدولت ایل خانی حکومت ایک اسلامی حکومت بن گئی تھی۔ چغتائی خاندان مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن تھا مگر قرہ، ہلاکو خاں کی مسلمان بیوی نے اسے سب سے پہلے اسلام سے متعارف کیا اور اسی کے اثر سے مبارک شاہ اور براق خاں مسلمان ہوئے۔ تاتاری فوجوں کے ہزارہا سپاہی اپنے ساتھ مسلمان عورتوں کو لے گئے تھے۔ انہوں نے اپنے مذہب کو چھوڑ کر اپنے کافر شوہروں کا مذہب اختیار کرنے کے بجائے انہیں اور زیادہ تر ان کے بچوں کو، مسلمان کرلیا اور انہی کی بدولت تمام بلادتاتار میں اسلام پھیل گیا۔ اسی طرح ملک حبش میں بھی خواتین ہی نے اشاعتِ اسلام کا کام کیا ہے چناں چہ متعدد ایسے حبشی رئیسوں کا تذکرہ تواریخ میں مذکور ہے جنہیں ان کی مسلمان بیویوں نے اسلام کا حلقہ بگوش بنالیا تھا۔ سنوسی مبلغین نے تو وسط افریقہ میں مستقل طور پر اشاعت اسلام کے لیے خواتین کے اداروں سے کام لیا ہے۔ چناں چہ وہاں سیکڑوں زنانہ مدارس قائم ہیں جن میں لڑکیوں کو اسلامی تعلیم دی جاتی ہے۔

صوفیائے کرامؒ کی خدمات، ہندستان میں

مگر مسلمانوں میں جو جماعت سب سے زیادہ تبلیغ دینِ الٰہی کے ذوق وشوق سے گرمِ سعی رہی ہے وہ وہی صوفیائے کرام کی جماعت ہے جو آج ہندستان(۱) میں اس طرف سے تقریباً بالکل ہی غافل ہے۔ خود ہندستان میں اولیاء وصوفیاء نے جس بے نظیر استقلال اور دینی شغف کے ساتھ اسلام کی روشنیوں کو پھیلایا ہے وہ ہمارے آج کل کے حضراتِ متصوفین کے لیے اپنے اندر ایک عمیق درسِ بصیرت رکھتا ہے۔ یہاں کے سب سے بڑے اسلامی مبلّغ حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ تھے، جن کی برکت سے راجپوتانہ میں اسلام کی اشاعت ہوئی اور جن کے بالواسطہ اور بلا واسطہ مریدین تمام اقطاع ملک میں اسلام کی شمعِ ہدایت لے کر پھیل گئے۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے دہلی کے اطراف میں، حضرت فرید الدین گنج شکرؒ نے علاقہ پنجاب میں، حضرت نظام الدین محبوب الٰہی نے دہلی اور اس کے نواح میں، حضرت سید محمد گیسودرازؒ، حضرت شیخ برہان الدینؒ اور حضرت شیخ زین الدینؒ اور آخر زمانہ میں (اورنگ آباد کے) حضرت نظام الدینؒ نے ملک دکن میں اور دورِ آخر میں حضرت شاہ کلیم اللہ جہان آبادیؒ نے دہلیِ مرحوم میں یہی دعوت الی الخیر اور تبلیغ اوامر اسلام کی خدمت انجام دی۔ ان کے علاوہ دوسرے سلسلوں کے اولیاءِ عظام نے بھی اس کام میں انتھک مستعدی سے کام لیا۔ پنجاب میں سب سے پہلے اسلامی مبلغ حضرت سیّد اسمٰعیل بخاریؒ تھے جو پانچویں صدی ہجری میں لاہور تشریف لائے تھے۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ لوگ ہزارہا کی تعداد میں ان کے ارشادات سننے آتے تھے اور کوئی شخص جو ایک مرتبہ ان کا وعظ سن لیتا وہ اسلام لائے بغیر نہ رہتا۔ مغربی پنجاب میں اسلام کی اشاعت کا فخر سب سے زیادہ حضرت بہاء الحق زکریا ملتانیؒ کو حاصل ہے۔ علاقہ بہاولپور اور مشرقی سندھ میں سیّد جلال بخاریؒ کے فیضانِ تعلیم سے معرفتِ حق کی روشنی پھیلی اور ان کی اولاد میں سے حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے پنجاب کے بیسیوں قبائل کو مسلمان کیا۔ ایک اور بزرگ حضرت سید جلال الدینؒ اور ان کے صاحبزادے حضرت حسن کبیر الدینؒ بھی پنجاب کے بہت بڑے اسلامی مبلغ تھے۔ حضرت حسن کبیر الدینؒ کے متعلق تواریخ میں لکھا ہے کہ ان کی شخصیت میں عجیب کشش تھی۔

---

(۱) غیر منقسم ہندستان یعنی موجودہ پاکستان، بنگلہ دیش اور بھارت مراد ہے۔

محض ان کے دیکھ لینے سے دل پر اسلام کی عظمت و صداقت کا نقش مرتسم ہو جاتا تھا اور لوگ خود بخود ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔

سندھ میں اشاعتِ اسلام کا اصل زمانہ وہ ہے جب حکومت کا دور ختم ہو چکا تھا۔ آج سے تقریباً چھ سو برس پہلے حضرت سید یوسف الدینؒ وہاں تشریف لائے اور ان کے فیضِ اثر سے لوہانہ ذات کے سات سو خاندانوں نے اسلام قبول کرلیا۔ کچھ اور گجرات میں حضرت امام شاہ پیرانویؒ اور ملک عبداللطیفؒ کی مساعی سے اسلام کی اشاعت ہوئی۔ بنگال میں سب سے پہلے شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے اس مقدس فرض کو انجام دیا جو حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مریدانِ خاص میں سے تھے۔ آسام میں اس نعمت عظمٰی کو حضرت شیخ جلال الدین فارسیؒ اپنے ساتھ لے گئے جو سلہٹ میں مدفون ہیں۔ کشمیر میں اسلام کا علم سب سے پہلے بلبل شاہؒ نامی ایک درویش نے بلند کیا اور ان کے فیض صحبت سے خود راجہ مسلمان ہو گیا جو تاریخوں میں صدر الدین کے نام سے مشہور ہے۔ پھر ساتویں صدی ہجری میں سیّد علی ہمدانیؒ سات سو سیدوں کے ساتھ یہاں تشریف لائے اور تمام خطۂ کشمیر میں اس مقدس جماعت نے نور عرفان کو پھیلایا۔ عالمگیر کے عہد میں سید شاہ فرید الدینؒ نے کشتوار کے راجہ کو مسلمان کیا اور اس کے ذریعے علاقہ مذکور میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔ دکن میں اسلام کی ابتدا پیر مہابیر کھمدایت سے ہوئی جو آج سے سات سو برس پہلے بیجاپور تشریف لائے تھے۔ ایک اور بزرگ جو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی اولاد میں سے تھے علاقہ کوکن (Konkan) کے ہادی اور رہبر تھے۔ دھاراواڑ کے لوگ اپنے اسلام کو حضرت شیخ ہاشم گجراتیؒ کی طرف منسوب کرتے ہیں جو ابراہیم عادل شاہ کے پیر طریقت تھے۔ ناسک میں حضرت محمد صادق سرمستؒ اور خواجہ اخوند میر حسینیؒ کی برکاتِ روحانی کا اب تک اعتراف کیا جاتا ہے۔ مدراس بھی اپنی ہدایت کے لیے چند صاحب حال بزرگوں کا رہین منت ہے جن میں سب سے زیادہ مشہور سید نثار شاہؒ مدفون ترچناپلی ہیں۔ دوسرے بزرگ سیّد ابراہیم شہیدؒ ہیں جن کا مزار اَرداری میں ہے اور تیسرے بزرگ شاہ الحامدؒ ہیں جن کا مدفن ناگوز میں واقع ہے۔ نیو گنڈا کی طرف اسلامی آبادی عام طور پر اپنے اسلام کو حضرت بابا فخر الدینؒ کی طرف منسوب کرتی ہے جنھوں نے وہاں کے راجہ کو مسلمان کیا تھا۔

حضرات صوفیائے کرام کی انہی تبلیغی سرگرمیوں کا اثر آج تک ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہندوؤں کی ایک بہت بڑی جماعت اگرچہ مسلمان نہ ہوسکی مگر اب تک اسلامی پیشواؤں کی گرویدہ ہے۔ چناں چہ ۱۸۹۱ء کی مردم شماری میں صوبہ شمال مغربی (موجودہ صوبہ متحدہ[1]) کے ۲۳۲۳۶۴۳ ہندوؤں نے اپنے آپ کو کسی خاص دیوتا کا پرستار بتلانے کے بجائے کسی نہ کسی مسلمان پیر کا پجاری ظاہر کیا تھا۔ افسوس کہ وہ لوگ ہندوؤں کی ایک کثیر آبادی پر اسلام کا غیر معمولی اثر چھوڑ گئے مگر آج ہم اس اثر سے بھی فائدہ اٹھانے کے قابل نہیں ہیں۔

ہندستان سے باہر

ہندستان سے باہر بعض دوسرے ممالک میں بھی اس مقدس جماعت کی تبلیغی سرگرمیوں نے حیرت انگیز نتائج پیدا کیے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ قرون متوسط کی تاریخ میں تو یہ واقعہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جب فتنۂ تاتار نے اسلامی حکومت کے قصر فلک بوس کی اینٹ سے اینٹ بجادی تو تمام وسط ایشیا میں صرف ایک صوفیائے اسلام کی روحانی قوت تھی جو اس کے مقابلے کے لیے باقی رہ گئی تھی اور بالآخر اسی نے اسلام کے اس سب سے بڑے دشمن پر فتح حاصل کی۔ لیکن مسلمانوں کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ یہ زبردست قوت بھی جس نے اقطاعِ عالم میں اسلام کی روشنی پھیلائی اور تاتار کے زبردست فتنے تک کو اس کے لیے مسخر کردیا، جو قریب تھا کہ وسط ایشیا سے اس کو بالکل فنا کردیتا، آج بالکل مضمحل ہوگئی ہے اور اگر ہمارے محترم حضرات متصوّفین ہمیں معاف کریں تو ہمیں اس امر واقعی کے اظہار میں کچھ بھی تامل نہیں ہے کہ اب وہ اسلام کی برکات وفیوض سے دنیا کو معمور کرنے کے لیے بہت حد تک خود ہی غیر اسلامی مفاسد سے مغلوب ہوکر رہ گئی ہے۔

افریقہ میں

موجودہ عہد میں یہ قوت صرف افریقہ میں زندہ ہے اور تبلیغ دین الٰہی کے سلسلے میں اس کی عظیم الشان کامیابیاں ہمارے ملک کے صوفیائے کرام کے لیے سرمایۂ عبرت وبصیرت ہیں۔ ان صوفی جماعتوں میں ایک ''جماعت امیر غنیّہ'' ہے جس کے بانی محمد عثمان الامیر غنی نے ۱۸۳۵ء

---

(۱) تقسیم ہند سے پہلے صوبہ متحدہ میں آگرہ، اودھ، روہیل کھنڈ اور بندیل کھنڈ شامل تھے۔

سے ۱۸۵۳ء تک مشرقی سوڈان کے مسلمانوں کی دینی اصلاح کی اور اطراف میں بیسیوں بت پرست قبائل کو مسلمان کر لیا۔

دوسری جماعت قادریہ ہے۔ مغربی افریقہ میں اس سلسلہ کے لوگ نویں صدی ہجری سے موجود ہیں۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں ان کے اندر بھی ایک نئی زندگی پیدا ہوئی اور انہوں نے مغربی سوڈان سے لے کر ٹمبکٹو اور سینگال تک اپنے حلقے قائم کر لیے۔ خصوصیت کے ساتھ نانگا ٹیمبو اور مسارڈو میں انہوں نے بہت بڑے حلقے قائم کر لیے اور نہایت کثرت سے بت پرست قبائل میں اسلام کی اشاعت شروع کر دی۔ ان کا اصول یہ ہے کہ جب کسی آبادی میں اسلام کی اشاعت کر چکتے ہیں تو وہاں کے ذہین اور صاحبِ استعداد لڑکوں کو اپنے مرکزی حلقوں میں تعلیم کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ یا اگر ان میں زیادہ صلاحیت دیکھتے ہیں تو علوم دینی کی تکمیل کے لیے قیروان، فاس، طرابلس یا الازہر (مصر) بھیج دیتے ہیں اور پھر واپسی پر انہی کو اپنی بستیوں میں تبلیغ و تعلیم کے لیے مقرر کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے نہایت کثرت سے اندرون افریقہ میں مدارس قائم کر رکھے ہیں اور ان میں صحیح اصولوں پر وحشی قبائل کے لڑکوں کی تربیت کرتے ہیں۔

ایک اور سلسلہ "تیجانیہ" کے نام سے مشہور ہے جو سب سے پہلے الجزائر میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کے اصول تبلیغ تقریباً وہی ہیں جو سلسلہ قادریہ کے ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ وہ تبلیغ کے ساتھ جہاد بھی کرتا ہے اور اس لیے عیسائی مشنریوں کو اس کے خلاف یورپی استعمار سے مدد حاصل کرنے کا اچھا خاصا بہانہ ہاتھ آجاتا ہے۔ اس کا حلقہ اثر شمالی افریقہ کا مغربی حصہ ہے اور اس کا سب سے زیادہ سرگرم داعی الحاج عمر تھا جو اپنے زہد و تقویٰ کے لیے افریقہ سے حجاز تک شہرت رکھتا تھا۔ اس نے ۱۸۳۳ء میں تبلیغ کا کام شروع کیا اور بالائی نائیجیریا اور سینگال تک کے بت پرست قبائل کو مسلمان کر کے ایک زبردست سلطنت قائم کر لی، جسے آخر میں فرانسیسی استعمار نے پیوند خاک کر دیا۔

ان تمام جماعتوں میں سب سے زیادہ زبردست سنوسی جماعت ہے۔ ۱۸۳۳ء میں الجزائر کے ایک مشہور عالم سیّدی محمد بن علی السنوسی نے طریقہ سنوسیہ کی ابتدا کی، جس کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح، فرنگی استعمار کی مدافعت اور اسلام کی اشاعت تھا۔ بائیس سال کے عرصے

میں انہوں نے ایک ایسی زبردست جماعت تیار کرلی جس کا نظام سلطنتوں کے نظام سے زیادہ مکمل تھا، جس کا ہر شخص جماعتی مقاصد کی لگن میں ڈوبا ہوا تھا اور جس کے ہر رکن کو خالص اسلامی تربیت دے کر سچا مسلمان بنا دیا گیا تھا۔ اس میں قرآن مجید کے لفظ لفظ پر عمل کرنا پہلی شرط ہے۔ اولیاء کی پرستش، مزارات کی زیارت، کافی اور تمباکو کا استعمال، عیسائیوں اور یہودیوں سے تعلقات، سب ممنوع ہیں اور ہر شخص ایک سچے مجاہد کی سی زندگی بسر کرتا ہے۔ مصر سے لے کر مراکش تک اور ساحل طرابلس سے لے کر صحرائے افریقہ کے آخری کونوں تک اس کی خانقاہیں قائم ہیں اور افریقہ کے علاوہ عرب، عراق اور جزائر ملایا تک اس کا اثر پھیلا ہوا ہے۔ اس کی تبلیغی کوششوں نے افریقہ کے ان تمام قبائل کو صحیح معنوں میں مسلمان بنا دیا ہے جو صرف برائے نام مسلمان رہ گئے تھے اور گالا، بٹسٹی اور بورکو کے علاقوں تک اسلام کی ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ قادریہ سلسلہ کے لوگوں کی طرح، ان کے ہاں بھی صرف وعظ و تلقین نہیں ہے بلکہ یہ مسلمان بنانے کے بعد نومسلموں کو عملی تربیت بھی دیتے ہیں تاکہ وہ خود اپنے ہم جنسوں کو اسلام کی دعوت دے سکیں۔

ان افریقی جماعتوں نے وحشی قبائل میں جو عجیب زندگی پیدا کردی ہے اس کے متعلق ایک یورپی سیّاح لکھتا ہے:

> ''دریائے نائیجیریا کے کنارے کنارے جب میں وسط افریقہ کی طرف روانہ ہوا تو پہلے دو سو میل تک مجھے اپنے خیالات کو بدلنے کی ضرورت نہیں ہوئی جو میں افریقی وحشت و بربریت اور مردم خوری کے متعلق رکھتا تھا مگر جب میں وسط سوڈان کے قریب پہنچ گیا تو مجھے قبائل کی زندگی میں ایسے ترقی پذیر آثار نظر آنے لگے جنہیں دیکھ کر میری رائے بدلنے لگی۔ میں نے دیکھا کہ وہاں مردم خوری کا کوئی وجود نہیں ہے۔ بت پرستی کا خاتمہ ہو چکا ہے، شراب خوری وغیرہ کی عادات زائل ہو چکی ہیں، تمام قبائل کپڑے پہنتے ہیں اور لباس میں نفاست، پاکیزگی اور معاشرت میں تہذیب موجود ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اخلاقی درجہ اپنے ہم جنس قبائل سے بہت بالاتر ہے۔ ہر چیز ترقی کرتی نظر آرہی ہے۔ حبشی فطرت کسی بلند تر فطرت سے بدل رہی ہے۔ اور یہ سب کچھ اسلام کے طفیل ہے۔ ''لوکوجا'' سے گزرنے کے بعد میں اسلامی تبلیغ کے اصل مرکز میں پہنچا اور وہاں میں نے ایک اعلیٰ درجہ کی منظم حکومت کو کارفرما پایا۔ ہر طرف آبادی میں تمدن کے آثار موجود تھے تجارت اور صنعت و حرفت کی گرم بازاری تھی اور مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں ایک مہذب ملک میں ہوں۔''

چوتھا باب

اشاعتِ اسلام افریقہ میں

ہم بار بار عرض کر چکے ہیں کہ مسلمانوں میں کبھی باقاعدہ مشنری سوسائٹیوں کا وجود نہیں رہا ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے مذہب نے خدمت دین کو کسی خاص طبقے تک محدود نہیں رکھا بلکہ ہر مسلمان پر یکساں فرض کیا ہے کہ وہ بشرط امکان اپنی تمام قوتیں دین کی خدمت میں صرف کر دیں۔ جس طرح عیسائیوں میں ایک خاص جماعت کے سوا نہ کوئی جماعت مذہبی امور میں حصہ لیتی ہے اور نہ مذہبی شغف رکھتی ہے اسی طرح اگر مسلمانوں میں بھی کوئی مذہبی طبقہ قائم کر دیا جاتا تو بہت ممکن تھا کہ ان میں بھی اپنے مذہب کی اشاعت کا ذوق صرف ایک مختصر سی جماعت تک محدود رہتا اور عام مسلمان اس سے بے بہرہ رہتے۔

> ''لیکن اس جمہوری مذہب کے لیے، جو فضیلت کا معیار صرف اعمال حسنہ کو قرار دیتا ہے، یہ بہت مشکل تھا کہ وہ برکت و سعادت میں بھی یہی تعمیم (عمومیت) نہ برتتا۔ چناں چہ دنیا میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کے پیروؤں میں اپنے مذہب کی تبلیغ کا ذوق سب سے زیادہ پایا جاتا ہے اور جس کا ہر فرد ایک مبلغ کی حیثیت رکھتا ہے۔''

ہم گزشتہ صفحات میں اس ذوقِ تبلیغ کی جہانگیری و عمومیت پر بحث کر چکے ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ اس مسئلے پر بھی روشنی ڈالی جائے کہ اس ذوق عمیم نے کس طرح ملکوں کو فتح کیا ہے اور وہ کون لوگ تھے جن کے ہاتھوں اسلام کو اس قدر عالم گیر وسعت حاصل ہوئی ہے۔ ہندستان(1)، ایران اور عرب و مصر وغیرہ ممالک کو جانے دیجیے کہ یہاں مسلمانوں کو حکومت بھی

---

(1) برصغیر پاک و ہند اور بنگلہ دیش۔

حاصل ہوئی ہے۔ اس لیے مخالفین یہ کہہ سکتے ہیں کہ بہت ممکن ہے کہ ان ممالک میں اشاعتِ اسلام تلوار کی رہینِ منّت ہو۔ ہمیں افریقہ، چین اور جزائر ملایا کو لینا چاہیے جہاں تمام مخالفین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام کو کبھی تلوار استعمال کرنے کا موقع نہیں ملا اور اس سے زیادہ ممالک تا تار و ترکستان کو لینا چاہیے جہاں تاریخ کا صریح فتویٰ یہ ہے کہ غیر مسلح اسلام نے مسلح کفر کا مقابلہ کر کے اسے شکست دی ہے۔ ان مثالوں سے ہم قارئین کرام کو یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ مذہبی شغف رکھنے والے مسلمانوں نے اس دین مقدس کی کس طرح خدمت کی ہے اور اگر ہم بھی اسی طرح مذہبی جذبے سے متحرک ہو جائیں تو کس طرح تبلیغ وحفاظتِ اسلام کے ان مسائل کو حل کر سکتے ہیں جن کے لیے کانفرنسوں پر کانفرنسیں منعقد کی جا رہی ہیں۔ اس سلسلے میں ہم سب سے پہلے افریقہ سے بحث کریں گے۔

افریقہ میں آفتابِ اسلام کا طلوع

مغربی سوڈان میں اسلام کی اشاعت سب سے پہلے ان نومسلم بربروں نے کی جو تجارت کے سلسلے میں وہاں آتے جاتے تھے۔ ان بربری قبائل میں لمطونہ اور جدالہ نامی دو قبیلوں نے یوسف بن تاشفینؒ کے عہد میں تقریباً تمام مغربی سوڈان کو اسلام کی روشنیوں سے منور کر دیا تھا۔ پانچویں صدی ہجری میں انہی بربری تاجروں نے گھانا (Ghana) کی حبشی ریاستوں کو مسلمان کر لیا اور اس کے بعد سوڈان کی قدیم ترین ریاست سونغائی (Songhay) بھی ان کے ہاتھوں مسلمان ہو گئی۔ چھٹی صدی ہجری میں ان کے اثرات دور دور تک پہنچ گئے اور اس کے بعد ٹمبکٹو کا مشہور تجارتی شہر اشاعتِ اسلام کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ حبشی لوگ تجارت کے سلسلے میں یہاں آتے تھے اور بربری تاجروں سے اسلام کی متاعِ گراں بہا لے کر تمام سوڈان اور نائیجیریا میں پھیل جاتے تھے۔ ان لوگوں میں مذہبی شغف اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ ابن بطوطہ جب وہاں پہنچا تو اس کے متعلق لکھتا ہے:

> ''یہ لوگ قرآن کے عاشق ہیں اور نماز کی پابندی کا یہ عالم ہے کہ جمعہ کے دن اگر سویرے سے جا کر مسجد میں نہ بیٹھ جاؤ تو جگہ ملنی محال ہو جاتی ہے۔''

ان نومسلم قوموں میں اسلام کی سب سے زیادہ سرگرم مبلّغ مانڈنگو قوم تھی جو تمام افریقہ

میں اپنی عادات وخصائل کے اعتبار سے نہایت ممتاز قوم ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ہاؤسا قوم نے اسی کی کوششوں سے اسلام قبول کیا اور ہاؤسا قوم وہ ہے جو وسطی بالائی افریقہ میں نہایت ذہین، مستعد اور تجارتی قوم شمار ہوتی ہے۔ تقریباً تمام سوڈان اور نائیجیریا کی تجارت پر قابض ہے اور گیانا سے لے کر قاہرہ تک اس کے تجارتی کارواں آتے جاتے ہیں۔ اشاعت اسلام کے لیے اس تجارتی قوم کی زبردست کوششوں کا ذکر آگے آتا ہے۔

مشرقی سوڈان میں اسلام کی اشاعت مصری تاجروں نے کی اور خصوصیت کے ساتھ کی جب مصر کی فاطمی خلافت کا خاتمہ ہوا تو بہت سے عرب بھاگ کر سوڈان کے علاقے میں پہنچ گئے اور انہوں نے اس علاقے میں دور دور اسلام کو پھیلا دیا۔ اس علاقے میں تونس اور طنجہ کے عرب تاجروں نے بھی اس فریضۂ مقدسہ کو انجام دیا ہے اور خصوصاً جنوب مغربی سوڈان اس سعادتِ عظمیٰ کے لیے انہی کا منّت کشِ احسان ہے۔ بعد میں احمد نامی ایک عرب نے ''دارفور'' میں اسلامی حکومت بھی قائم کر دی جسے کئی سو برس بعد محمد علی پاشا نے اپنی حکومت میں جذب کر لیا۔

اٹھارہویں صدی کے اواخر میں

اٹھارہویں صدی کے اواخر میں بالائی افریقہ کے مسلمانوں میں ایک نئی تبلیغی روح پیدا ہوئی جس کی ابتدا شیخ عثمان وانفودیو سے ہوتی ہے۔ اس شخص نے عبدالوہاب نجدیؒ کی تعلیمات سے متاثر ہو کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی مردہ سنّت میں دوبارہ جان ڈال دی۔ خصوصیت کے ساتھ فلبی (Fulbe) قوم میں اُس نے کچھ ایسا اسلامی جوش بھر دیا کہ وہ اسلام کی خدمت کے لیے سر بکف کھڑی ہو گئی اور ''گوبر'' (Gobar) کی قدیم ریاست میں بت پرستی کا خاتمہ کر کے تمام ہاؤسا لینڈ کو کفر و شرک کی نجاستوں سے پاک کر دیا۔ ۱۸۱۶ء میں جب عثمان وانفودیو کا انتقال ہوا تو وہ ممالک ہاؤسا کا کامل خود مختار بادشاہ تھا اور اس کے وسیع قلم رو میں کہیں بت پرستی کا نام ونشان تک باقی نہ تھا۔ ۱۹۰۰ء میں انگریزوں نے اس اسلامی حکومت کا خاتمہ کر دیا، مگر ہاؤسا اور فلبی قوموں کے ذوقِ تبلیغ پر اس کی محکومی کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ چناں چہ اسی بیسویں صدی میں انہوں نے یوروبا کے بت پرست علاقہ کو اسلام سے روشناس کرایا ہے اور دریائے نائجر کے جنوب تک دین مبین کی اشاعت کی ہے۔ اجیبو کے علاقہ میں پہلی مرتبہ انہوں نے ۱۸۹۴ء میں اپنا کام شروع

کیا اور چند ہی سال میں اس قدر ترقی کی کہ ۱۹۰۸ء میں وہاں کے ایک شہر میں بیس اور دوسرے میں بارہ مسجدیں بن گئیں۔ اسی طرح دریائے نائجر کے جنوب میں وہ ۱۸۹۸ء کے بعد اسلام کا پیغام لے کر گئے اور ۱۹۱۰ء میں یہ کیفیت ہوگئی کہ اس علاقے میں مشکل ہی سے کوئی قبیلہ ایسا رہ گیا ہوگا جس نے اس صدائے حق پر لبیک نہ کہا ہو۔

افریقہ کا مغربی ساحل مسلمانوں کا ایک اور تبلیغی میدان ہے۔ گیانا، سرالیون، لائبیریا اور منڈی[1] وغیرہ ساحلی علاقوں میں آج سے کوئی سوا سو برس پہلے مسلمان تاجروں اور دیگر کاروباری آدمیوں نے تبلیغ اسلام کی ابتدا کی اور تھوڑی ہی مدت میں وہاں کی وحشت کو تہذیب وتمدن سے بدل دیا اور ۱۸۰۲ء میں سیرالیون کی ایک انگریز کمپنی نے دارالعلوم میں ایک درخواست پیش کرتے ہوئے لکھا تھا:

> ''یہاں سے تقریباً چالیس میل کے فاصلے پر آج سے ستر برس پہلے چند مسلمان تاجر آکر مقیم ہوئے تھے۔ عام مسلمانوں کی طرح یہاں بھی انہوں نے مدرسے قائم کر کے اسلامی تعلیم دینی شروع کردی اور اس بات کا عہد کرلیا کہ جو شخص اسلام قبول کرلے گا اسے غلام بنا کر نہیں بیچا جائے گا۔ تھوڑے عرصے میں یہاں تہذیب اور تمدن کے اثرات رونما ہونے لگے، آبادی بڑھ گئی، خوش حالی نے ترقی کی اور رفتہ رفتہ اس علاقے میں اسلام کا اثر سب پر غالب آگیا۔ لوگ فوج در فوج مسلمانوں کے مذہب میں داخل ہو رہے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عنقریب سارا علاقہ مسلمان ہو جائے گا۔''

سرالیون ہی کے لوگوں میں جو تبلیغ اسلام ہوئی اس کے متعلق ڈاکٹر ویمر کہتا ہے:

> ''ان لوگوں کے یہاں کوئی خاص جماعت تبلیغ دین کے لیے مخصوص نہیں بلکہ ان کا ہر فرد مبلغ ہے۔ جہاں کہیں پانچ چھ مسلمان جمع ہو جاتے ہیں وہیں ایک مسجد بن جاتی ہے۔ اور وہ چھوٹی سی عمارت ہی اس بستی میں اشاعت اسلام کا مرکز ہوتی ہے۔ ان کے اصول بھی نہایت سادہ ہیں۔ ہر شخص جو کلمہ پڑھ کر نماز پڑھنے اور شراب سے پرہیز کرنے کا اقرار کرلیتا ہے وہ اِن کی عالم گیر برادری کا ایک رکن بن جاتا ہے۔''

گیانا میں اس کے سرگرم مبلغ ہاؤسا قوم کے تاجر ہیں۔ ان کی دل کش معاشرت اور

---

(۱) Mendi سرّالیون سے تقریباً ایک سو میل جنوب میں ایک علاقہ۔

امتیازی شان وحشی قبائل کو ان کے گرد کھینچ لاتی ہے اور وہ نہایت کامیابی کے ساتھ انہیں اپنے مذہب میں داخل کر لیتے ہیں۔ داہومی اور اشانتی میں ان قوموں نے ابھی چند ہی سال سے کام شروع کیا ہے ـــــ اس لیے تمام مغربی افریقہ میں یہی دو علاقے ایسے ہیں جہاں ابھی تک تھوڑا بہت کفر و بت پرستی کا نام ونشان باقی ہے۔ لاگوس میں مسلمانوں کا بڑا زور ہے۔ ان کی آبادی تقریباً پندرہ ہزار تک پہنچ چکی ہے جن میں فلّی، ہاؤسا اور مانڈنگو تینوں قوموں کے لوگ موجود ہیں۔ اپنے کاروبار کے سلسلے میں ان لوگوں کو دور دور تک جانا پڑتا ہے۔ اس لیے ان کی بدولت تمام سواحل نائیجیریا اور گولڈ کوسٹ نور اسلام سے منور ہو رہا ہے۔ سینگال کے دہانہ سے لاگوس تک دو ہزار میل کے ساحل پر تقریباً ایک بستی بھی ایسی نہیں جہاں کم از کم ایک مسجد اور ایک مولوی موجود نہ ہو۔ ہر مسلمان خواہ وہ تاجر ہو یا انگلستان وفرانس وبلجیم کا ملازم، اس کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ جس کافر و بت پرست سے ملتا ہے اس تک قرآن کی تعلیم پہنچا دیتا ہے۔ اس زبردست ذوق تبلیغ نے عیسائی مشنریوں کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے۔

مشرقی افریقہ بھی عربی تاجروں ہی کے ذریعہ اسلام کی سعادتِ عظمیٰ سے بہرہ اندوز ہوا۔ بیسویں صدی عیسوی تک ان لوگوں نے تمام سواحل زنج کو اسلام سے روشناس کر دیا تھا اور جگہ جگہ اسلامی بستیاں قائم ہوگئی تھیں مگر اصل تبلیغی کام اس وقت شروع ہوا جب جرمنی، انگلستان اور اٹلی وغیرہ نے ان ممالک میں نو آبادیاں قائم کیں اور اندرون ملک تک پہنچنے کے ذرائع مکمل کر لیے۔ اس وقت نظام حکومت قائم کرنے کے لیے ان سلطنتوں کو مسلمانوں کے سوا اور کوئی جماعت نہیں مل سکتی تھی۔ چناں چہ فوج، پولس، عدالت، تعلیمات، مال گزاری، غرض ہر محکمہ میں مسلمان بھرتی کیے گئے اور انہوں نے اندرون افریقہ میں پہنچ کر سب سے زیادہ گرمی کے ساتھ جو خدمت انجام دی وہ اسلام کی اشاعت تھی۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں انہوں نے بوندی (Bondei) اور وادیگو قبائل کو تقریباً بالکل مسلمان کر لیا۔ ۱۹۰۵ء کے بعد وہ مغرب میں ٹانگانیکا تک اور شمال میں اوسمبارا تک اور جنوب میں نیاسا تک قرآنی تعلیمات لے کر پھیل گئے۔ ۱۸۹۱ء میں اوسمبارا میں ایک بھی مسلمان نہیں تھا بلکہ ان سے نفرت کی جاتی تھی، مگر جب باقاعدہ حکومت قائم ہوئی اور مسلمان افسر وہاں پہنچے تو تھوڑے ہی عرصہ میں تقریباً تمام وہ لوگ مسلمان ہو گئے جو سرکاری

افسروں سے کوئی واسطہ رکھتے تھے اور اکثر ان مدارس میں اسلام پھیل گیا جہاں مسلمان مدرّس مامور تھے۔ اسی طرح نیا سالینڈ میں بھی دس سال کے اندر اندر اسلام نے حیرت انگیز ترقی کی ہے اور مسیحی مبلغین معترف ہیں کہ ان ممالک میں مسلمان بن جانا انسان بن جانے کا ہم معنی ہے۔

کیپ کالونی میں اسلام کی اشاعت جزائر ملایا کے تاجروں نے کی ہے۔ یہ لوگ حکومت ہالینڈ کے زیر اثر ہونے کے باعث عرصے سے یہاں مقیم ہیں اور نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے دین کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ ۱۸۰۹ء میں کولبروک نے لکھا تھا:

> ''ہمارے مبلغین کی انتہائی کوششوں کے باوجود مسلمان مبلغ نہایت کثرت کے ساتھ سیاہ رنگ غلاموں اور آزاد لوگوں کو مسلمان کرنے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ ہمارے مشنری کافی وقت اور کثیر روپیہ خرچ کر کے بھی بہ مشکل چند آدمیوں کو عیسائی کرتے ہیں، مگر مسلمان مبلغ بغیر کسی دقت کے جم غفیر اکٹھا کرتے جا رہے ہیں۔''

گزشتہ پچاس ساٹھ سال سے بیرونی مسلمان بھی یہاں پہنچ گئے ہیں اور انہوں نے تبلیغی کام میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ اس وقت خصوصیت کے ساتھ کلیرا ماؤنٹ میں تبلیغ کا سب سے زیادہ زور ہے اور یتیم ولاوارث بچے نہایت کثرت کے ساتھ مسلمان ہو رہے ہیں۔

پانچواں باب

اشاعت اسلام چین میں

افریقہ کے بعد مسلمانوں کی تبلیغی فتوحات کا دوسرا میدان مشرق اقصیٰ ہے۔ یہاں بھی محض تاجروں، سپاہیوں اور عام کاروباری مسلمانوں نے محض اپنے طبعی ذوق اور اسلامی جوش کی بنا پر اسلام کی اشاعت کی اور باوجودیکہ انہیں دولت وحکومت کی کبھی تائید حاصل نہ ہوسکی بلکہ اکثر حالات میں دشمنوں کی تلوار کا مظلومانہ مقابلہ کرنا پڑا لیکن پھر بھی انہیں اپنے دین کی اشاعت میں اس قدر زبردست کامیابی حاصل ہوئی کہ اس وقت چین و جزائر ملایا میں ان کی مجموعی آبادی کسی طرح آٹھ نو کروڑ سے کم نہیں ہے۔

چین میں اسلام کی ابتدا دولتِ بنواُمیہ کے عہد سے ہوتی ہے۔ اگرچہ خلفائے راشدین ہی کے مبارک زمانے میں وہ عرب تاجر، جن کی بحری ترک تازیوں نے بحرِعرب سے لے کر بحرالکاہل تک تمام سمندروں کو چھان مارا تھا، سواحلِ چین پر اسلام کو لے کر پھیل گئے تھے لیکن زرد قوم سے اسلام کا باقاعدہ تعارف اس وقت ہوا جب دولتِ بنو امیہ کے عہد میں چینیوں سے سفارتی تعلقات بھی قائم ہوگئے۔ بعد میں جب بادشاہ سوان سونگ (Hsuan T Sung) کو ایک غاصب نے تخت سے محروم کردیا تو اس کے بیٹے نے خلیفہ منصور عباسی سے مدد طلب کی اور اس نے چار ہزار سپاہی اس کی مدد کو بھیج دیے، جن کی قوت بازو کے طفیل اس نے دوبارہ تاج وتخت حاصل کیا۔ یہ سپاہی اسلام کے اصل مبلّغ تھے۔ انہوں نے وطن واپس آنے کے بجائے چین ہی کو اپنا وطن بنالیا۔ یہیں شادی بیاہ کیے اور عام چینی آبادی میں تبلیغِ اسلام کا ایسا سلسلہ شروع کیا کہ چند صدیوں کے اندر کینٹن کا سارا علاقہ اسلام کی روشنی سے معمور ہوگیا۔

اشاعت اسلام، منزل بہ منزل

اس واقعہ کے چھ سو برس بعد پھر ایک مرتبہ چین میں باہر سے اسلامی عناصر داخل ہوئے اور وہ تمام ملک میں پھیل گئے۔ یہ عرب، ایرانی اور ترکی مہاجرین تھے جو ساتویں صدی ہجری میں منگولی سیلاب سے بہہ کر یہاں چلے آئے تھے۔ ان لوگوں کی وجہ سے سوڈیڑھ سو برس کے اندر اندر چین کے اکثر اطراف میں اسلام کی اشاعت ہوگئی اور خصوصیت کے ساتھ شمالی اور مغربی چین میں پورے کے پورے علاقے مسلمان ہوگئے۔ تیرہویں صدی عیسوی میں مارکو پولو کا بیان ہے کہ "یُنّان (Yunnan) کا صوبہ بڑی حد تک مسلمان ہو چکا ہے۔" چودہویں صدی کا ایک اور مورّخ لکھتا ہے کہ تالیفو کی پوری آبادی مسلمان ہے۔ جنوبی چین کے متعلق ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ تمام شہروں میں پورے کے پورے محلّے مسلمانوں کے موجود ہیں جو اپنی پاکیزگی اور تہذیب کے اعتبار سے نہایت ممتاز ہیں۔ مسلمان چینی عورتوں سے شادیاں کرتے اور عام چینیوں سے نہایت عمیق تعلقات رکھتے ہیں اور اس کی بدولت اسلام بہت تیزی سے پھیل رہا ہے۔ پندرہویں صدی میں ایک مسلمان تاجر علی اکبر لکھتا ہے کہ پیکنگ میں تقریباً تیس ہزار مسلمان خاندان آباد ہیں۔ سترہویں صدی کی ابتدا میں چینی یہودیوں کی ایک بہت بڑی جماعت مسلمان ہوگئی — اٹھارہویں صدی میں کین لنگ نے زنگاریہ کی بغاوت فرو کر کے دس ہزار خاندانوں کو وہاں لے جا کر آباد کیا جو آس پاس کی اسلامی آبادی سے متاثر ہو کر سب کے سب مسلمان ہوگئے۔ "شیان تنگ" (Chantong) میں ایک قحط کے موقعے پر مسلمانوں نے دس ہزار چینی بچوں کو پناہ دی اور ان سب کو مسلمان کر لیا۔ ایک اور قحط کے موقعے پر کوان تنگ (Kwang Tung) میں مسلمانوں کو تقریباً دس ہزار چینی بچے مل گئے جنہیں اسلامی تربیت دے کر پالا گیا۔ اس طرح کے غیر معمولی مواقع کے علاوہ عام حالات میں بھی مسلمان اس کثرت سے اسلام کی اشاعت کرتے ہیں کہ ایک چینی مسلمان سید سلیمان کے بقول ہر سال اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد کا احصا کرنا بہت مشکل ہے۔

موجودہ عہد میں[1] بھی چینی مسلمانوں کے اندر تبلیغ اسلام کا خاص ذوق موجود ہے۔

---

(۱) مراد ہے ۱۹۲۵ء کے زمانے میں۔

تاجروں اور صناعوں کے علاوہ حکومت کے مسلمان ملازم بھی عمومیت کے ساتھ ان حلقوں میں دین مبین کی تبلیغ کرتے ہیں جن سے انہیں میل جول کا موقع ملتا ہے۔ اور چینی فوج کے مسلمان افسر اور سپاہی بھی اس فرض سے غافل نہیں ہیں۔ کچھ عرصے سے چینی مسلمانوں نے اپنی پوزیشن کو محسوس کر کے تبلیغ اسلام کی اہمیت کو زیادہ اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ چناں چہ پہلے کانسو میں ایک تبلیغی مدرسہ قائم کیا گیا تھا اور اب تقریباً دس صوبوں میں ایسے ہی مدارس قائم ہو گئے ہیں۔ اگر چین میں باہر سے آئے ہوئے مسلمانوں کا شمار کیا جائے تو شاید ان کی تعداد ایک لاکھ سے متجاوز نہ ہو مگر صرف یہی عالم گیر ذوق تبلیغ ہے جس نے انہیں پانچ کروڑ کی عظیم الشان تعداد تک پہنچا دیا ہے اور جس کی بدولت ایک روسی مبصر یہ دیکھ کر کانپ اٹھا ہے کہ اگر اشاعت اسلام کی رفتار کا یہی حال رہا تو کچھ عجیب نہیں کہ ایک وقت میں مسلمان سیاست مشرق اقصیٰ کا نقشہ بالکل بدل دیں گے۔(۱)

---

(۱) اشتراکیت کے سیلاب کے بعد چین میں اہل اسلام پر جو مصیبت گزری ہے اس کا واضح اندازہ اس زمانے کے اور موجودہ زمانے کے حالات کا مقابلہ کرنے سے بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ اشتراکی انقلاب کے وقت وہاں مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ سے زائد تھی لیکن ۱۹۶۱ء کی سرکاری مردم شماری کے مطابق یہ تعداد کم ہو کر صرف ایک کروڑ رہ گئی۔
فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ ٥

چھٹا باب

اشاعتِ اسلام جزائر ملایا میں

جزائر ملایا[1] میں اسلام کے مبلّغ وہ عربی اور ہندی تاجر تھے جو بحری استعمار کے میدان میں پُرتگال کے قدم رکھنے سے پہلے، تمام چین اور جزائر شرق الہند کی تجارت پر قابض تھے۔ وہ اسپینوں اور پُرتگالیوں کی طرح فاتح بن کر نہیں آئے تھے اور نہ تلوار کی مدد سے اپنے مذہب کی اشاعت کرنا چاہتے تھے۔ ان کے پاس ایسی بھی کوئی قوت نہ تھی جس سے وہ بالاتر قوت بن کر رہتے۔ وہ صرف ایک ایمان کی قوت رکھتے تھے۔ ایک حق وصداقت کی متاع لے کر آئے تھے۔ انہی ہتھیاروں سے انہوں نے تمام جزائر ملایا کو فتح کیا۔ انہی کے بل پر انہوں نے حکومت کو تسخیر کیا اور انہی کی قوت سے انہیں یہ فروغ حاصل ہوا کہ چھ سو برس کے اندر مجمع الجزائر کی پانچ کروڑ آبادی میں سے چار کروڑ کے قریب مسلمان ہوگئی۔ قدیم بت پرستانہ توہمات نے انہیں قدم قدم پر روکا۔ ہسپانیہ اور پرتگال کی استعماری ہوسنا کی بار بار ان پر تلوار سونت کر کھڑی ہوگئی اور ہالینڈ[2] مسیحی قوت نے ان کی ہمّت شکنی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، مگر کوئی چیز ان کے جذبۂ خدمتِ دین پر غالب نہ آسکی اور انہوں نے اپنی ذہانت، مستعدی، استقلال اور دولت کو اپنی شان وشوکت بڑھانے کے بجائے، اپنے مذہب کی قوت بڑھانے میں صرف کردیا۔ ان کی

---

(۱) مراد ہیں جزائر شرق الہند، جواب انڈونیشیا اور ملیشیا کہلاتے ہیں۔ انڈونیشیا کی فیڈریشن میں جاوا، ساترا، بورنیو (کالی منٹن) حلیبس سلاویسی)، مغربی نیوگنی (ویسٹ اریان) اور ہزاروں چھوٹے چھوٹے جزیرے شامل ہیں۔ اور فیڈریشن آف ملیشیا، ملایا کی گیارہ ریاستوں اور برطانوی شمالی بورنیو (صباح) اور ساراوک پر مشتمل ہے۔

(۲) ملیشیا یکم فروری ۱۹۴۸ء کو برطانوی تسلط سے آزاد ہوا اور انڈونیشیا کو ہالینڈ کی طویل غلامی سے ۱۷ اگست ۱۹۵۰ء کو نجات حاصل ہوئی۔

کوششوں سے گزشتہ چھ صدیوں کے اندر جزائر ملایا میں جس طرح اسلام کی اشاعت ہوئی ہے اس کی داستان نہایت سبق آموز ہے۔

سماترا

سماترا میں اسلام کی ابتدا اتچہ سے ہوئی جہاں ایک بزرگ عبداللہ عارف نے سب سے پہلے صدائے حق بلند کی اور اس کے بعد ان کے مرید برہان الدین نے پریامان تک تمام مغربی ساحل کو اسلام سے روشناس کرادیا۔ ۱۲۰۵ء میں پوری ریاست اتچہ نے اسلام قبول کرلیا اور خود راجہ بھی مسلمان ہوگیا جس کو ''جہاں شاہ'' کا لقب دیا گیا۔ یہاں سے سواحل کی تجارتی کشتیوں پر اسلام شمالی سماترا میں پہنچا۔ پرلاک اور لسپوری میں مسلمانوں کی تجارتی نوآبادیاں قائم ہوئیں۔ چودہویں صدی عیسوی میں مکہ کے چند علماء، شیخ اسمٰعیل کی سرکردگی میں سماترا پہنچے اور انہوں نے لمبری سے آرو تک تمام ساحلی علاقے تک نور اسلام سے منور کردیا۔ آخر سمدرا کا راجہ مسلمان ہوگیا۔ جس کو ''الملک الصالح'' کا لقب دیا گیا۔ اور اس کی کوششوں سے پرلاک کی ریاست بھی مسلمان ہوگئی۔ ابن بطوطہ اپنی سیاحت کے دوران میں جب یہاں پہنچا تو ''الملک الصالح'' کا بیٹا ''الملک الظاہر'' حکمراں تھا اور سلطان محمد تغلق سے اس کے سفارتی تعلقات قائم تھے۔

پالمبانگ

پالمبانگ میں ہندو مذہب کا اثر سب سے زیادہ قوی تھا۔ پندرہویں صدی کے وسط میں راڈن رحمت نے جو جاوا کا سب سے بڑا اسلامی مبلّغ تھا، یہاں اسلام کی اشاعت کی اور اس کے بعد بھی اسلام کا اثر پھیلتا رہا۔ مگر اس علاقے کو صحیح معنوں میں اسلام کی نعمت اس وقت میسّر ہوئی ہے جب یہاں ہالینڈ کی حکومت قائم ہونے کے بعد مسلمانوں نے عیسائی مشنریوں کے مقابلے میں انتھک کوششیں شروع کی ہیں۔ چناں چہ بیسویں صدی کی ابتدا سے یہاں کی بت پرست آبادی نہایت کثرت کے ساتھ اسلام قبول کررہی ہے۔

جنوبی سماترا

جنوبی سماترا میں اسلام کی اشاعت سب سے آخر میں ہوئی۔ یہاں اسلام کا پہلا داعی

ایک جاوی سردار منک کمالا بومی تھا جس نے بنٹام میں اسلام قبول کیا، مکہ جا کر علوم اسلامیہ کی تحصیل کی اور لمپا نگ میں نہایت کثرت سے بت پرست قبائل کو مسلمان کیا۔ اب تمام جزیرۂ سماترا میں صرف ایک بٹک ایسا مقام رہ گیا ہے جہاں قدیم بت پرستی کا اثر ہے۔ اس علاقے نے اس زمانے میں تو اسلام کی حلقہ بگوشی اختیار نہیں کی جب کہ وہ ہر طرف سے طاقت ور اسلامی ریاستوں کے درمیان گھرا ہوا تھا مگر اب ہالینڈ کی سخت گیر مسلم کش حکومت قائم ہونے کے بعد وہ اسلام کی اطاعت قبول کر رہا ہے۔ ہالینڈ نے تلوار کی قوت سے اسلام کی اشاعت کو روکنے کی کوشش کی مگر اس سے مسلمانوں کا جوشِ تبلیغ بہت زیادہ تیز ہو گیا اور انہوں نے مسیحی مبلغین کو شکست فاش دی۔ چناں چہ خود ایک مشنری کا بیان ہے کہ ایک موقع پر پورے دو گاؤں جو بپتسمہ لے چکے تھے دفعتاً مسلمان ہو گئے۔ اسی طرح ایک اور جگہ صرف ایک امام مسجد کی کوشش سے سپر وک کا پورا ضلع مسلمان ہو گیا۔ ایک اور مبلغ کے متعلق عیسائی مشنریوں کا بیان ہے کہ اس نے دس سال کے عرصے میں بت پرستوں کے ایک قبیلہ کو عیسائیت کے اثر سے نکال لیا۔ سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ خود حکومت ہالینڈ کے سرکاری ملازم بھی تبلیغ اسلام کا کام کرتے ہیں اور حکومت اس کام کی مخالف ہونے کے باوجود انہیں روکنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔

جزیرۂ سماترا سے اسلام کا اثر جزیرہ نمائے ملایا میں پہنچا۔ بارہویں صدی عیسوی میں سماترا کے بہت سے مسلمان تجارت کی غرض سے سنگاپور میں جا کر آباد ہوئے اور ایک صدی بعد انہوں نے ملکا کی بندرگاہ میں اپنی نو آبادی قائم کی۔ ان کی کوششوں سے سواحل کی اکثر تجارتی آبادی مسلمان ہو گئی اور ان کے ذریعہ اندرون ملایا اسلام کی اشاعت ہوئی۔ چودھویں صدی عیسوی میں یہاں کا راجہ بھی ایک عرب تاجر سیدی عبد العزیز کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا اور اس کا نام سلطان محمد شاہ رکھا گیا۔ سولھویں صدی کی ابتدا میں ملایا کی جنوبی ریاست کویڈا بھی اسلام کے اثر میں آ گئی اور ۱۵۰۱ء میں وہاں کے راجہ پیراؤنگ مہاونگ نے ایک مسلمان عالم شیخ عبد اللہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا جس کا نام سلطان مزلف رکھا گیا اس راجہ نے اپنی ساری زندگی اسلام کی اشاعت میں صرف کر دی اور مرنے سے پہلے ریاست کویڈا کے ایک بڑے حصے کو بت پرستی کی لعنت سے آزاد کر دیا۔

ملایا سے اسلام کا اثر سیام پہنچا اور سنگاپور کے مسلمان تاجروں نے اسے ہند چینی[1] تک پہنچا دیا۔ اس وقت ان دونوں ممالک میں اسلام کا جتنا اثر پایا جاتا ہے وہ سب انہی تاجروں کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔

جاوا

جزائر ملایا میں ہندویت اور بت پرستی کا سب سے زیادہ اثر جزیرۂ جاوا میں تھا۔ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیمات کے باوجود اوہام پرستی کے عقائد صدیوں تک ان لوگوں کی طبیعتوں پر مستولی رہے اور منو کی دھرم شاستر کے رواج کا تو ۱۷۶۸ء تک پتہ چلتا ہے لیکن ان تمام عمیق اور راسخ اثرات کو اسلام کے خاموش مبلّغوں نے صدیوں کے اندر بالکل دور کر دیا اور اس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ تمام جزیرۂ جاوا کی آبادی، بہ استثنائے قلیل، مسلمان ہو چکی ہے اور جاوی مسلمانوں کا شغفِ دینی شرق الہند کے جزائر میں سب سے زیادہ بڑھا ہوا ہے۔[2]

اس عظیم الشان کام کی ابتدا ایک جاوی تاجر حاجی پُروانے کی جو پاجاجارن کے راجہ کا بڑا بیٹا تھا۔ اس نے تخت و تاج اپنے چھوٹے بھائی کے لیے چھوڑ دیا اور خود مال تجارت لے کر ہندستان پہنچا۔ یہاں آ کر متاعِ دُنیا کے بجائے متاعِ آخرت اسے نصیب ہوگئی، اور اس نے سب کو چھوڑ کر اپنی زندگی کا مقصد صرف اس نعمت سے اپنے ہم وطنوں کو بہرہ ور کرنا قرار دے لیا۔ چناں چہ ایک عرب عالم کو لے کر جاوا پہنچا اور تمام عمر اسلام کی خدمت کرتا رہا۔ اس کے بعد عربی اور ہندی تاجروں اور سیاحوں کی توجہ اس جزیرہ کی طرف منعطف ہوگئی اور انہوں نے کثرت سے یہاں آ کر سواحل پر اسلام کی اشاعت شروع کر دی۔ اس قسم کے سیاحوں کی بڑی جماعت چودہویں صدی میں مولانا سید ابراہیم کی زیر قیادت گریسک (Gresik) میں وارد ہوئی اور اس کو جاوا کی تاریخ میں سب سے پہلی مرتبہ یہ کامیابی حاصل ہوئی کہ چرمن کے راجہ نے اسلام قبول کر لیا اور یہیں سے قریبی ریاستوں میں اسلام پھیلنا شروع ہوگیا۔

---

(۱) انڈوچین

(۲) یہ ذکر ۱۹۲۵ء کا ہے۔

''راڈن رحمت'' کا ظہور رحمت

پندرھویں صدی میں جزیرۂ جاوا کا سب سے بڑا اسلامی مبلّغ راڈن رحمت پیدا ہوا جس نے اسلام کو غربت کے بوریئے سے اٹھا کر بادشاہی اور بالادستی کے تخت پر پہنچا دیا۔ اس نے شاہانہ ناز و نعم میں پرورش پائی تھی اور اگر چاہتا تو خود بھی کسی تخت کا مالک بن جاتا مگر اس کے دل میں اپنی نفسانیت کی خدمت کے بجائے اپنے مذہب کی خدمت کا جوش بھرا ہوا تھا۔ اس لیے اپنی زندگی کا مقصدِ وحید صرف تبلیغ و اشاعتِ اسلام کو قرار دیا اور:

وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (الشعراء: ۲۱۴)

''اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ۔''

کے ارشادِ ربانی کے مطابق سب سے پہلے اپنے خاندان سے تبلیغ کا کام شروع کیا۔ اس نے اپنے نانا کو جو چمپا کا راجہ تھا، اسلام کی دعوت دی۔ پھر ''پالم بانگ'' پہنچا اور اپنے رشتے کے بھائی آریہ وامر کو جو راجہ کی طرف سے وہاں کا گورنر تھا، مسلمان کر لیا۔ اس کے بعد مولانا جمادی الکبری کی معیّت میں ''ماجاپاہت'' (Majapahit) پہنچا اور راجہ کو جو اس کا خالو تھا، اسلام کی دعوت دی۔ راجہ نے خود تو اسلام قبول نہیں کیا مگر اسے امپل کا گورنر مقرر کر کے پوری آزادی کے ساتھ اشاعتِ اسلام کی آزادی دے دی۔ چناں چہ اس نے اپنے زمانۂ گورنری میں امپل کے تقریباً تین ہزار خاندانوں کو مسلمان کیا اور اسلامی مبلغین کی ایک بڑی جماعت کو اطراف و جوانب کے جزیروں اور ریاستوں میں پھیلا دیا۔ شیخ خلیفہ حسین، جس نے مدورا کو اسلام کی روشنیوں سے معمور کر دیا تھا، اسی کا فرستادہ تھا۔ مولانا اسحٰق جنہوں نے ریاست ''بالمنگن'' میں اسلام کی اشاعت کی، اسی کے فیض یافتوں میں سے تھے۔ راڈن پاکو (Raien Paku) جس نے گریسک کے علاقہ میں بت پرستی کا کھوج مٹا دیا تھا، اسی کے فیض تربیت کا پروردہ تھا۔ خود اس کے دونوں بیٹے بھی جاوا کے مشہور اسلامی مبلغین میں شمار ہوتے ہیں اور اس کے دو قریبی رشتہ دار راڈن پٹہ (Raden Patah) اور راڈن حسین، جاوا کی تاریخ میں اس حیثیت سے بہت مشہور ہیں کہ انہوں نے ہندو مذہب کی سب سے بڑی قوت یعنی ماجاپاہت کو قطعی طور پر مسخر کر لیا۔ راڈن حسین

نے ماجاپاہت کی فوج کو سپہ سالار ہونے کی حیثیت سے اسلام کی طرف دعوت دی اور راڈن پٹہ نے ۱۴۷۸ء میں کفر کو آخری شکست دے کر ماجاپاہت کو ایک اسلامی حکومت بنا دیا۔

مغربی جاوا

مغربی جاوا میں اشاعت اسلام کا کام اس سے بھی زیادہ مشکل تھا کیوں کہ وہاں کے ہندو عام جاویوں سے بھی زیادہ راسخ العقیدہ تھے۔ اگر چہ وہاں مولانا حسن الدین چیریبونی (Cheribon) جیسے زبردست اسلامی مبلغین نے بڑی سرگرمی سے اسلام کی تبلیغ کی تھی لیکن ہندومت ایک عرصے تک دین الٰہی کا مقابلہ کرتا رہا، یہاں تک کہ سولہویں صدی میں حق کی آخری فتح ہوئی اور ''پاجاجارن'' کی ہندو ریاست کلیتاً مسلمان ہوگئی۔

اس طرح بارہویں صدی سے شروع ہو کر سولہویں صدی تک چار سو برس کے عرصے میں جزیرۂ جاوا کی تسخیر مکمل ہوگئی اور بغیر کسی قتل و خون کے محض تبلیغ و تلقین کی قوتوں سے ہندومت نے اسلام کے مقابلے میں ہتھیار ڈال دیے۔

مجموعہ جزائر ملکاّ

جاوا کے بعد اسلامی قوت کا دوسرا مخزن ''مجموعۂ جزائر ملکاّ'' ہے۔ یہاں اسلام کی اشاعت بہت بعد میں ہوئی ہے۔ بلکہ اکثر مقامات پر تو ہسپانی اور پرتگالی تجارت اور اسلام دونوں ساتھ ساتھ پہنچے اور پُر امن مسلمان تاجروں نے جنگ آزما مسیحیت کے مقابلے میں اپنے مذہب کی کامیاب تبلیغ کی۔ پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی کے درمیان یہاں جاوا اور ملایا کے تاجروں نے، جو لونگ اور مسالے کے جہاز بھر کر لاتے تھے، اسلام کی اشاعت شروع کی اور تھوڑے ہی عرصے میں ان کے ذوق تبلیغ نے یہ کرشمہ دکھایا کہ پورے مجموعہ جزائر میں اسلام پھیل گیا اور چار زبردست اسلامی حکومتیں قائم ہوگئیں ایک ٹرینٹ (Ternate) کی حکومت تھی، جس کا سلطان ٹرینٹ الماہرہ کے ایک معقول حصہ پر حکمراں تھا۔ دوسری ٹیڈور کی حکومت تھی، جس میں جزیرہ ٹیڈور، (Tidor) الماہرہ (Halemahera) کا ایک حصہ، سیرام کا ایک حصہ اور نیو گیانا کا مغربی حصہ شامل تھا۔ تیسری حکومت سلطان گلولو (Gilolo) کی تھی جو وسط الماہرہ اور شمالی سیرام پر حکومت کرتا تھا اور چوتھی

بت جان (Batjan) کی حکومت تھی، جس کا اقتدار جزیرۂ بت جان اور جزائر اوبی (Obi) پر حاوی تھا۔ یہ چاروں سلطنتیں کچھ مدت تک بہار دکھانے کے بعد مسیحی استعمار کی بادسموم سے مرجھا کر فنا ہو گئیں مگر اسلام کا وجود نہ ان کا منت کش تھا اور نہ ان پر انحصار رکھتا تھا۔ چناں چہ اب[1] ہالینڈ وغیرہ کی مسیحی طاقتوں میں تقسیم ہو جانے کے بعد بھی جزائر ملاکا میں نہایت تیزی کے ساتھ اسلام پھیل رہا ہے اور عنقریب وہ زمانہ آنے والا ہے کہ جب اسلام کے سوا وہاں اور کوئی مذہب نہ رہے گا۔

ان جزائر میں سب سے پہلے جزیرہ ٹیڈور اسلام کا حلقہ بگوش ہوا۔ پندرہویں صدی میں ایک عرب تاجر شیخ منصور نے یہاں کے راجہ کو مسلمان کر کے اس کا نام جمال الدین رکھا۔ ۱۵۲۱ء میں جب ہسپانوی مستعمرین (آبادکاروں) کی دوسری مہم یہاں پہنچی ہے تو جمال الدین کا بیٹا سلطان منصور حکمراں تھا اور اسلام کو پھیلے ہوئے صرف پچاس سال گزرے تھے۔ پرتگالی تاجروں کا بیان ہے کہ ٹرینٹ میں ٹیوڈور سے بھی پہلے اسلام کی اشاعت ہو چکی تھی۔ چناں چہ ۱۵۲۱ء میں، جب پُرتگالی مہم وہاں پہنچی تھی، اس کا مورّخ لکھتا ہے کہ یہاں اسلام کو پھیلے ہوئے اسی برس گزر چکے ہیں۔ اس جزیرے میں اشاعت اسلام کا عجیب قصہ ہے۔ ایک جاوی تاجر داتو ملا حسین، جو اپنی تجارت کے سلسلے میں یہاں آ کر مقیم ہوا تھا، روزانہ صبح کو بلند آواز سے قرآن پڑھتا تھا۔ اس کی آواز پر بت پرست عاشق ہو گئے اور کثرت سے اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ تھوڑی مدت میں اس نے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی جماعت پیدا کر لی اور آخر ۱۴۹۵ء میں خود راجہ نے بھی گریسک جا کر اسلام قبول کر لیا۔

امبوئنا

امبوئنا میں ایک مقامی تاجر ''پاٹی پوٹہ'' (Pati Putah) نے اسلام کی روح پھونکی اور جاوا سے اس متاع گراں بہا کو لا کر تمام سواحل امبوئنا میں اسے پھیلا دیا۔ یہ پرتگالی استعمار کے ابتدائی عروج کا زمانہ تھا۔ پرتگالیوں نے تلوار کی قوت سے اس مذہب کی ترقی کو روکنا چاہا جس سے دراصل وہ صلیبی لڑائیوں کا بدلہ لینے کے لیے نکلے تھے مگر ان کے سخت مقابلے کے باوجود دین حق کی ترقی پر کوئی اثر نہیں پڑا، بلکہ عام باشندوں میں اس کو کچھ زیادہ ہی مقبولیت حاصل ہو گئی۔

(۱) یعنی ۱۹۲۵ء میں۔

چناں چہ جب سولہویں صدی کے اواخر میں پرتگال اپنے اندرونی خدشوں میں مبتلا ہوا تو امبوئنا والوں نے تمام مسیحی مشنریوں کو مار مار کر نکال دیا اور جوق در جوق اسلام کے دائرے میں داخل ہونے لگے۔ ان جزائر کے ساتھ تجارتی تعلقات ہونے کی وجہ سے ملکا کے بقیہ جزائر بھی مسلمان ہو گئے۔

جزیرہ بورنیو

۱۵۲۱ء میں گلولو کا راجہ مسلمان ہوا۔ اس صدی میں بورنیو بھی نورِ اسلام سے فیضیاب ہوا۔ سب سے پہلے ریاست ''بنجر ماسن'' (Banjarmasin) نے اسلام قبول کیا۔ پھر شمالی بورنیو کی ریاست برونامی مسلمان ہوئی۔ اس کے بعد ۱۵۵۰ء میں پالمبانگ کے تاجروں نے سوکڈنا (Sukadana) کی ریاست میں اسلام پھیلایا اور ۱۵۹۰ء میں بورنیو کا سب سے طاقت ور راجہ مسلمان ہو گیا، جس کا نام سلطان محمد صفی الدین رکھا گیا۔ ۱۶۰۰ء میں جب ایک مغربی سیاح بورنیو پہنچا تو اس نے دیکھا کہ تمام سواحل مسلمان ہو چکے ہیں اور صرف اندرونی علاقے میں کفر و بت پرستی کا اثر باقی ہے۔ اٹھارہویں صدی کی ابتدا سے اندرون بورنیو میں بھی اسلام کی اشاعت شروع ہو گئی۔ ایک طرف سرمایہ دار اور منظّم مسیحی جماعتیں اپنے مذہب کی تبلیغ کر رہی ہیں اور دوسری طرف منتشر اور بے زر مسلمان تاجر اپنے دین کی طرف بلا رہے ہیں مگر دنیا یہ دیکھ کر حیران ہے کہ مسیحی ناکام ہیں اور مسلمان کامیاب۔ انہوں نے چند سال کی کوششوں سے شمالی بورنیو کی ایک بہت بڑی قوم ''ایدان'' کو مسلمان کر لیا ہے اور وسطِ بورنیو کی ''ڈائک'' قوم بھی مسیحیت کے مقابلے میں اسلام کو زیادہ پسند کرتی ہے۔

جزیرہ سلیبس

جزیرۂ سلیبس (Celebes) میں بھی اسلام کی اشاعت اسی عام اصول کے مطابق ہوئی کہ پہلے جاوی اور ملائی تاجر اسلام کو لے کر سواحل پر پہنچے اور پھر دیسی تاجروں کے ذریعے وہ اندرون ملک میں پہنچ گیا۔ ۱۵۴۰ء میں جب پرتگالی مستعمرین یہاں پہنچے تو اسلام کی ابتدا ہو رہی تھی اور صرف گوا (Gova) میں چند مسلمان رہتے تھے۔ ساٹھ سال کے اندر اندر اسے اتنی ترقی ہوئی

کہ تمام سواحل مسلمان ہوگئے اور مکاسر کی ریاست نے راجہ سمیت اسلام قبول کیا۔ مکاسر سے الفرا اور بوگی قوموں میں اس کی اشاعت ہوئی اور موخر الذکر قوم پر اس کا یہ اثر ہوا کہ اس کی تمام فطری قابلیتیں جاگ اٹھیں، اس کی ذہانت، جفاکشی اور مستعدی نے اسے جزائر ملکا کی سب سے زیادہ مہذب قوم بنا دیا۔ اور اب وہ ایک مبلّغ قوم کی حیثیت سے شرق الہند میں ایک خاص حیثیت رکھتی ہے۔ نیوگیانا سے لے کر سنگاپور تک اس کے تاجر اپنے جہاز لے کر پھرتے ہیں اور ان کے اثر سے نہایت تیزی کے ساتھ اسلام پھیل رہا ہے۔ سمباوا، لومبوک (Lombok) جزیرہ چوب صندل، وغیرہ تمام جزائر میں اس کی بدولت دینِ مبین کی اشاعت ہوئی اور خود سلیبس میں اس نے مسیحیت کو نہایت زبردست شکست دی۔ اٹھارہویں صدی میں مسیحی مبلغین نے بولانگ (Bolaang) اور مونگونڈاو (Mongondou) کے راجہ کو عیسائی کرلیا تھا اور اس کے اثر سے پوری ریاست عیسائی ہوگئی تھی۔ مگر لوگی تاجروں نے ایک صدی کے اندر اندر اسے عیسائیت کے چنگل سے آزاد کرالیا اور آخر ۱۸۴۴ء میں خود راجہ جیکوبس نے اسلام قبول کرلیا۔

جزائر فلپائن

نہتّے اسلام کے اعجازِ تسخیر کا سب سے بڑا مظاہرہ جزائر فلپائن میں ہوا۔ یہاں اسلام[1] کی ابتدا ملایا کے ایک تاجر شریف کا بنگ سُوان نے کی تھی جو اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ منڈاناؤ میں آکر آباد ہوا تھا۔ یہاں اس نے کثرت کے ساتھ اہل فلپائن کو مسلمان کیا اور اس کے بعد مسلمان تاجروں کی آمد اور اسلام کی اشاعت کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔ ان وحشی قبائل میں اسلام کی تعلیم کا یہ اثر تھا کہ ۱۵۲۱ء میں جب ہسپانوی مستعمرین وہاں پہنچے تو انہوں نے مسلمانوں اور کافروں کی معاشرت، تہذیب اور اخلاق میں ایک نمایاں امتیاز پایا اور انہیں حیرت ہوئی کہ اس قلیل عرصے میں بت پرست وحشیوں کی زندگی میں یہ عظیم انقلاب کیوں کر پیدا ہوگیا۔ چوں کہ یہاں اسلام کا اثر بہت حدیث العہد (تازہ) تھا اس لیے ہسپانیہ[2] نے اسے مٹا کر مسیحیت کو پھیلانے کے لیے نہایت سخت کارروائیاں شروع کیں اور تلوار کے زور سے قبائل کو عیسائی بنانے

(۱) یہ ۱۹۲۵ء کا ذکر ہے۔

(۲) اسپین

لگے۔ یہ سلسلہ بیسویں صدی کے مہذب ایام کی ابتدا تک جاری رہا اور اسپین نے مذہب کی خاطر ظلم وستم ڈھانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ لیکن اس کے باوجود وہاں مسیحیت کے مقابلے میں اسلام کی اشاعت نہایت تیزی کے ساتھ ہوئی، کیوں کہ فلپائن کے لوگ ہزاروں کی تعداد میں تمام اطراف سے بھاگ بھاگ کر منڈاناؤ اور سولو کی اسلامی ریاستوں میں آئے تھے اور فوج درفوج اسلام قبول کرتے تھے، اور پھر حیرت یہ ہے کہ انیسویں صدی کے آخر میں جب یہاں امریکہ کا تسلّط قائم ہوا اور مذہبی تشدّد کا دور ختم ہو گیا تو اشاعت اسلام کی وہ تیز رفتاری بھی باقی نہیں رہی۔ تاہم زمانۂ امن میں مسلمان تاجر نہایت کثرت کے ساتھ اطراف میں پھیل گئے اور جدید ترین خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں خاموش اسلامی تبلیغ کا سلسلہ نئے سرے سے جاری ہو گیا ہے۔

نیوگنی

نیوگیانا میں اسلام کی اشاعت جدید ترین عہد سے تعلق رکھتی ہے اور زیادہ تر سواحل تک محدود ہے۔ ابتداءً اس کا مغربی علاقہ سلطان بت جان کے تابع فرمان تھا اس لیے سولھویں صدی میں شمال مغربی گیانا میں اسلام کا اثر زیادہ وسعت اختیار کر گیا۔ ۱۶۰۶ء میں مسلمان تاجر اسے مغرب کی طرف بھی لے گئے اور جزیرہ نمائے اونین (Onin) کی بت پرست آبادی میں اسلام کو پھیلا دیا۔ مگر ان اطراف میں اشاعت اسلام کا اصل زمانہ انیسویں صدی کا ہے۔ انیسویں صدی کے وسط میں جزیرۂ آدی (Adi) نے اسلام قبول کیا اور بیسویں صدی کی ابتدا میں سیرام اور گورام کے مسلمان تاجروں نے پلاوا وغیرہ جزائر کو اسلام سے روشناس کیا۔ جزائر کائی (Kai) میں انیسویں صدی کے وسط تک مسلمانوں کا نام ونشان نہ تھا۔ صرف جزیرہ بندا (Banda) کے چند تاجر رہا کرتے تھے دفعتاً ۱۸۷۸ء میں تبلیغ کا کام شروع ہوا اور تھوڑی ہی مدت میں مدورا، جاوا اور بامی کے مسلمان تاجروں نے اس قدر کثرت کے ساتھ جزائر کائی کے باشندوں کو مسلمان کر لیا کہ اس وقت وہاں مسلمانوں کی تعداد سولہ ہزار سے متجاوز ہے جو کل آبادی کے نصف کے برابر ہے۔

مجمع الجزائر ملایا میں اسلام کی عظیم الشان کامیابی، جس کا مختصر سا حال آپ نے ان سطور میں ملاحظہ کیا ہے، چھ صدیوں کی خاموش مساعی کا نتیجہ ہے جو زیادہ تر تاجروں اور عام سیّاحوں نے

انجام دی ہیں۔ان کے پاس کوئی تلوار یا حاکمانہ قوت نہیں تھی بلکہ صرف تبلیغ دین الٰہی کا ایک زندہ و تابندہ ذوق وشوق تھا، جس نے انہیں اپنے سفر کے خطرات ومہالک اور تجارتی منافع کی زر پرستانہ زندگی میں بھی مذہب کی خدمت کا والہ وشیدا بنائے رکھا اور ان کے اندر ایسی شیفتگی پیدا کر دی کہ انہوں نے تمام دوسرے مقاصد کو ثانوی درجہ دے کر صرف دعوت الی الخیر اور تبلیغ دین مبین کو اپنا اولین مقصد قرار دیا۔ جدید دور میں بھی، جب کہ تمام دنیا کے مسلمان بہ استثنائے افریقہ، فرض سے غافل ہو گئے ہیں، شرق الہند کے عام مسلمانوں میں یہ ذوق باقی ہے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ اب بھی وہاں تاجروں اور کاروباری آدمیوں کے علاوہ حکومت ہالینڈ کے سرکاری ملازم تک تبلیغِ اسلام کے فرائض انجام دیتے ہیں اور ان لوگوں نے ملائی زبان کو اس قدر کثرت کے ساتھ اسلامی لٹریچر سے بھر دیا ہے کہ جو غیر مسلم، سرکاری زبان ہونے کی حیثیت سے اس کو سیکھتے ہیں وہ اسلامی تعلیمات سے ضرور متاثر ہوتے ہیں اور اکثر اوقات مسلمان ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

ساتواں باب

دعوتِ عمل

یہ طویل داستان سرائی محض اس لیے نہیں تھی کہ اس سے کچھ افسانہ ہائے پارینہ کو چھیڑنا مقصود تھا بلکہ اس سے دراصل ہم یہ بتانا چاہتے تھے کہ اسلام کی دینی اور دنیاوی قوت کا اصل سرچشمہ وہی دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے جس پر اس کی ساری زندگی کی بنیاد رکھی گئی تھی اور جس کے لیے مسلم نام کی ایک قوم کو حضرت حق جل شانہٗ نے پیدا کیا تھا اور چوں کہ پیغام کی فطرت اس بات کو چاہتی ہے کہ اسے مرسل الیہ تک پہنچایا جائے اس لیے تبلیغ خود اسلام کی فطرت میں شامل ہے۔ اسلام حقیقت میں ایک الٰہی پیغام ہے جس کی مخاطب کرۂ ارض کی تمام بشری مخلوقات ہے اور ہر شخص جس تک یہ آسمانی برکتوں کا پیغام پہنچ جائے اس امر پر عنداللہ مامور ہے کہ اپنی بنی نوع کے زیادہ سے زیادہ افراد تک اس کو پہنچا دے۔ یہی حقیقت تھی جس کو آیت کریمہ:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ (آل عمران:۱۱۰)

”دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔“

میں ظاہر کیا گیا تھا، اور یہی ایک مقصد تھا جسے پورا کرنے کے لیے اللہ عزوجل نے مسلمانوں کی قوم کو پیدا کیا تھا:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ (آل عمران:۱۰۴)

''تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی رہنے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔''

اس ماموریت کے احساس نے اسلام کی تیرہ سو سالہ زندگی میں جو حیرت انگیز کرشمے دکھائے ہیں ان کا ایک نہایت مختصر سا خاکہ پیش کیا جا چکا ہے۔ اس کے مطالعے سے یہ حقیقت خوب روشن ہو گئی ہو گی کہ جن مسلمانوں میں اپنے مسلمان ہونے کی ذمّے داری کا احساس موجود تھا انہوں نے کس طرح:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ

(النحل:۱۲۵)

''اے نبیؐ! اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو، حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ۔''

کے امر الٰہی پر عمل کرتے ہوئے محض تلقین و تبلیغ کی قوت سے ایک دنیا کو اسلام کے لیے مسخر کر لیا۔ افریقہ کے وسیع براعظم میں بغیر کسی جبر و لالچ اور مکر و دغا کے جس طرح کروڑوں آدمی اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے، چین میں بغیر کسی مادّی اور جبّاری قوت کے جس طرح آبادیوں کی آبادیاں اسلام کی تابع فرمان بن گئیں، جزائر ملایا میں نہتّے اور بے زور تاجروں کے ہاتھوں جس طرح ۴/۵ آبادی خدائے واحد کی پرستار بن گئی، تاتارستان کے مسلم کش اور خونخوار وحشیوں کو ضعیف اور نازک عورتوں اور بے نوا درویشوں نے جس طرح اسلام کے آستانۂ رحمت پر لا کر جھکا دیا اس کی بصیرت افروز داستان ہم نے اسی احساس کے کرشمے دکھانے کے لیے اپنے برادرانِ ملت کے سامنے پیش کی ہے اور اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ان میں بھی کسی طرح یہ احساس جاگ اٹھے۔

۱۸۵۷ء کے بعد کی تبلیغی سرگرمیاں

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے زمانے میں مسلمانانِ ہند کی اسلامی حمیّت کو جو دل گداز صدمات پہنچے تھے انہوں نے کچھ عرصے کے لیے ان کی دینی حسّیات کو بیدار کر دیا تھا اور اس کی بدولت ۱۸۵۷ء کے بعد تقریباً چالیس سال تک اشاعتِ اسلام کا کام نہایت تیزی کے ساتھ ہوتا رہا، مگر افسوس کہ بعد میں استیلائے کفّار کے اثر سے وہ دینی احساس اور وہ ذوق تبلیغ ختم

ہو گیا اور خدمتِ دین کا وہ عام جوش جو کچھ عرصے کے لیے پیدا ہو گیا تھا، آپس کی کفر بازیوں اور باہمی جنگ و فساد میں کام آنے لگا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر کی تاریخ پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو یہ حیرت انگیز واقعہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ اس زمانے میں کوئی باقاعدہ تبلیغی نظام قائم نہ ہونے کے باوجود نومسلموں کی تعداد میں ہر سال دس ہزار سے لے کر چھ لاکھ تک اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اس زمانے میں علماء اور واعظین کی ایک بہت بڑی جماعت ایسی پیدا ہوگئی تھی جس نے اپنی زندگی تبلیغ دین کے لیے وقف کر دی تھی اور اپنی انفرادی حیثیت میں شہر در شہر پھر کر سیکڑوں آدمیوں کو مشرف بہ اسلام کیا تھا۔ ان کے علاوہ عام کاروباری مسلمانوں میں بھی یہ ذوق اس قدر پھیل گیا تھا کہ دفتروں کے ملازم اور معمولی دوکان دار تک اسلام کی اشاعت کرتے تھے۔ چناں چہ انجمن حمایت اسلام[1] کی پرانی رپورٹوں میں ہم مدارس کے اساتذہ، سرکاری محکموں کے ملازموں، چھوٹے چھوٹے تاجروں، حتیٰ کہ ایک اونٹ گاڑی والے تک کو اپنے دین کی اشاعت میں مشغول پاتے ہیں۔

لیکن اب...

موجودہ دور میں اشاعتِ اسلام کی سست رفتاری کی وجوہ پر اگر غور کریں تو یہ بالکل صاف نظر آتا ہے کہ اس کی ذمّے داری صرف ہماری اپنی ہی غفلت اور دینی بے حسی پر عائد ہوتی ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ اسلام آج بھی وہی ہے جو پہلے تھا۔ اس کی فطرت میں کوئی تغیر نہ ہوا ہے اور نہ ہوسکتا ہے، البتہ ہم بدل گئے ہیں۔ ہماری زندگی بدل گئی ہے، ہمارے جذبات وحسّیات بدل گئے ہیں۔ اور یہ سب تنزل اسی کا نتیجہ ہے۔ پس اگر آج ہندستان[2] میں اشاعت اسلام کا مسئلہ ایک نازک صورت اختیار کر گیا ہے تو اس کا صحیح حل یہ نہیں ہے کہ ہم کانفرنسوں پر کانفرنسیں منعقد کریں۔ انجمنوں پر انجمنیں بنائیں، رسالوں پر رسالے شائع کریں اور محض شور وشغب میں اپنا وقت ضائع کر دیں، بلکہ اس کا اصل حل یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کو مسلمان بنائیں، ان میں صحیح اسلامی روح پھونک دیں، ان کی زندگیوں کو خالص اسلامی زندگی کے قالب میں ڈھال دیں، ان کے اندر سے ان تمام باطل عقائد، مبتدعانہ رسوم اور غلط عادات کو دور کر دیں جو صدیوں تک ایک

---

(۱) (لاہور۔ پاکستان)

(۲) مراد ہے متحدہ ہندستان۔

مشرک قوم کے ساتھ رہتے رہتے پیدا ہوگئی ہیں اور ان کے اندر مذہبیت کا ایک ایسا جذبہ پیدا کردیں جو ہر مسلمان کو اپنے دین کا ایک سرگرم مبلغ بنا دے۔

ہم نے جگہ جگہ اس بات پر زور دیا ہے کہ مسلمانوں نے کبھی عیسائیوں کی طرح مشنری سوسائٹیاں بنا کر کام نہیں کیا۔ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ ہم تنظیم کے ساتھ کام کرنے کے مخالف ہیں بلکہ دراصل مراد یہ ہے کہ یہ کام محض ایک جماعت یا چند جماعتوں کا نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے مسلمانوں میں تبلیغ دین کے ایک ایسے عام ذوق کی ضرورت ہے کہ ہر مسلمان اپنے آپ کو اس مقدس کام کے لیے مامور سمجھنے لگے۔

محض تبلیغی جماعتیں یا ہمہ گیر ذوق تبلیغ؟

اگر عام مسلمان اس ذوق سے بے بہرہ رہیں اور محض ایک انجمن یا چند انجمنوں پر یہ کام چھوڑ دیا جائے تو ہم کبھی غیر مسلموں کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہوسکتے کیوں کہ ہر جگہ مسلمانوں کا عام ذوق تبلیغ ہی فتح و کامرانی سے سرفراز ہوا ہے۔ اگر افریقہ میں مسلمانوں کا یہ عام ذوق نہ ہوتا اور صرف چند انجمنیں ہی فریضۂ تبلیغ کو انجام دینے کے لیے چھوڑ دی جائیں تو عیسائیوں کی بدرجہا زیادہ طاقت ور اور دولت مند سوسائٹیوں کے مقابلے میں انہیں قیامت تک وہ کامیابی نصیب نہیں ہوسکتی تھی جس پر آج ساری مسیحی دنیا انگشت بدنداں رہ گئی ہے۔ اس طرح اگر مجمع الجزائر ملایا میں عام تاجروں اور سیاحوں کا جذبۂ خدمتِ دینی کام نہ کرتا اور صرف وہ چند عربی اور ہندی واعظین اور علماء ہی دعوت اسلام کا فرض انجام دیتے جو وقتاً فوقتاً وہاں پہنچتے رہے تھے تو شاید آج بحرالکاہل کے ساحلوں پر اذان کی وہ گونج اس کثرت سے سنائی نہ دیتی جو آج بت پرستی اور مسیحی استعمار کے متحدہ مزاحمت کے باوجود سنائی دے رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دعوتِ اسلام ایک فرض کفایہ ہے جس کے لیے کسی ایک جماعت کا کھڑا ہوجانا تمام امت کے لیے کفایت کرتا ہے لیکن شریعت کی یہ رخصت محض مسلمانوں کی آسانی کے لیے ہے نہ کہ انہیں دینی خدمات سے بالکل سبک دوش اور بے پروا کردینے کے لیے۔ اس رخصت کا مطلب اگر کچھ ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ یہ فرض عائد تو تمام مسلمانوں پر ہوتا ہے، جسے سب کو ادا کرنا چاہیے، لیکن کم از کم ایک جماعت تو ایسی ضرور رہنی چاہیے جو ہمیشہ بالالتزام اسے ادا کرتی رہے اور وہ جماعت یقیناً علماء و صلحائے امت کی جماعت ہے۔

پس ہمارے نزدیک اسلام کی اشاعت کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم غیر مسلموں کو مخاطب کرنے کے بجائے خود مسلمانوں کو مخاطب کریں اور ان میں اس قسم کی مذہبی روح پھونک دیں کہ ہر مسلمان ایک مبلّغ بن جائے، اس سے نہ صرف فریضۂ تبلیغ ہی بہترین صورت سے انجام پائے گا بلکہ ہمارے سیکڑوں دینی امراض کو بھی خود بہ خود شفا ہو جائے گی۔

اصلاحِ حال کے لیے چند عملی تدابیر

ان مختلف اصلاحی تدابیر میں سے چند تدبیریں، جو دیگر ممالک کے تبلیغی تجربات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہمارے خیال میں اشاعتِ اسلام کے لیے مفید ہیں ہم یہاں درج کرتے ہیں۔ امید ہے کہ زعمائے ملّت اِن پر غور کریں گے:

(ا) ذات پات اور عدم مساوات کا خاتمہ

مسلمانوں میں سے ذات پات کے اس امتیاز کو مٹا دیا جائے جو ہندوؤں کی ہمسائے گی سے ان کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ اسلام کا یہ مساوات پرور عقیدہ کہ کوئی انسان اپنی خلقت کے اعتبار سے نجس یا ذلیل نہیں ہے، ہمیشہ اس کی کامیابی کا بڑا ذریعہ رہا ہے اور ضرورت ہے کہ ہم دوبارہ اس کو اپنے تمام معاملات میں ایک بنیادی اصول کی حیثیت سے داخل کر لیں۔

(ب) نسبی امتیازات کا خاتمہ

ہمارے یہاں عام طور پر نومسلموں کو نسبی مسلمانوں کے مقابلے میں ادنیٰ سمجھا جاتا ہے۔ اس غیر اسلامی عقیدے کا سختی کے ساتھ استیصال کر دینا چاہیے، اور نومسلم عورتوں اور مردوں سے شادی بیاہ کے تعلقات قائم کرنے کی رسم دوبارہ زندہ ہونی چاہیے۔ ہمارے ہاں کے شرفاء اس سے پرہیز کرتے ہیں مگر ہم میں کا کوئی شریف ترین آدمی بھی رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے مقابلے میں اپنی شرافت کو پیش نہیں کر سکتا، جنہوں نے دو نومسلموں، یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی بیٹیاں لی تھیں اور دو نومسلموں، یعنی حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کو اپنی بیٹیاں دی تھیں۔

(ج) اخوت اسلامی کا فروغ

مسلمانوں میں اخوتِ اسلامی کے جذبہ کو ترقی دینی چاہیے تاکہ غیر مسلموں کو اسلامی برادری میں داخل ہونے کا شوق پیدا ہو۔

(د) عام دینی اور اخلاقی زندگی کی اصلاح

اگر مسلمانوں کی اندرونی زندگی کی اصلاح کسی عمیق تحریک کی محتاج ہو تو کم از کم ان کی ظاہری زندگی میں ایسی اسلامی کشش پیدا کرنی چاہیے کہ غیر مسلم قومیں خود بہ خود ان کی طرف کھنچنے لگیں۔ مثلاً نماز باجماعت اور روزوں کی پابندی، مشرکانہ رسوم و بدعات سے احتراز اور منہیات شرعیہ سے پرہیز کی عام تلقین کی جائے اور خصوصاً مسلمانوں میں اخلاقی جرائم کے استیصال کی سخت کوشش کی جائے، کیوں کہ جب مسلمانوں کا اخلاقی درجہ بلند ہوگا تو غیر مسلموں کے دل میں ان کی عظمت قائم ہو جائے گی۔

(ہ) مذہبی مسائل کی تعلیم اور تبلیغی سرگرمیوں کی تحریک و ترغیب

جمعہ کے مواعظ، شبینہ مجالس و مدارس اور عام رسائل کے ذریعے مسلمانوں کو مذہبی مسائل کی تعلیم دی جائے۔ تقابل ادیان کے معمولی مباحث نہایت وضاحت کے ساتھ بتائے جائیں اور ان کے اندر تبلیغ کا شوق پیدا کیا جائے۔ خصوصیت کے ساتھ مدارس کے اساتذہ، سرکاری محکموں کے ملازموں اور عام کاروباری لوگوں میں اس تحریک کو پھیلانا بہت مفید ہے، کیوں کہ انہیں عوام سے بہت زیادہ میل جول کا موقع ملتا ہے اور وہ بہت کامیابی کے ساتھ تبلیغ کر سکتے ہیں۔

حرفِ آخر

یہ ایک نہایت زبردست کام ہے اور اس کو انجام دینے کے لیے ضرورت ہے کہ ہمارے علماء اور سجادہ نشین حضرات اپنے حجروں سے نکلیں۔ علماء کا فرض تو ظاہر ہے کہ انہیں درجہ ''خشیۃ''[1]

(۱) اس آیۂ قرآنی کی طرف اشارہ ہے اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر:۲۸) ''حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف (صفات الٰہی کا) علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں۔''

اور انبیاے بنی اسرائیل سے مشابہت جیسی فضیلتیں کچھ مفت ہی نہیں مل گئی ہیں بلکہ ان پر امت کی اصلاح و ہدایت کا ایک بہت بڑا بار رکھ دیا گیا ہے جسے اٹھانے میں ذرہ برابر بھی کوتاہی کرنے پر وہ خدا کی شدید گرفت سے نہیں بچ سکتے۔ مگر ہم حضراتِ صوفیائے کرام کو بھی ان کا فرض یاد دلانا چاہتے ہیں۔ جن سجادہ ہائے طریقت پر وہ جلوہ فرما ہیں وہ ارشاد و ہدایت کی مسندیں ہیں۔ ان کی وراثت اپنے ساتھ صرف چند فضیلتیں اور دنیاوی فوائد ہی نہیں رکھتی بلکہ وہ بہت سی ذمے داریاں اور بہت سی مسئولیتیں بھی رکھتی ہے، جن کے احساس نے قدمائے متصوفین کو اسلام کی خدمت کے سوا اور کسی مطلب ہی کا نہ رکھا تھا۔ آج اگر یہ حضرات ان ذمّے داریوں کو محسوس کرلیں جو ایک مسلمان سے بیعت لینے کے بعد اس کی اصلاح و تزکیۂ نفس کے لیے ان پر عائد ہوتی ہیں تو مسلمانوں کے سینکڑوں مصائب کا علاج ہوسکتا ہے۔ بڑے بڑے سجادہ نشینوں اور پیرانِ طریقت کا حلقۂ ارادت کم از کم کروڑ ڈیڑھ کروڑ مسلمانوں[1] پر مشتمل ہے اور اس میں ان کو ایسا زبردست اثر حاصل ہے کہ وہ اپنے ایک اشارے سے ان کی زندگیوں کا نظام بدل سکتے ہیں۔ ایسی کثیر جماعت میں اسلامی خدمت کا جوش پیدا کردینا یہ معنی رکھتا ہے کہ چند ہی سال میں اس سرزمین کا نقشہ بدل جائے۔ تو کیا ہم یہ امید کرسکتے ہیں کہ یہ حضرات اپنے کاشانۂ امن و عافیت سے نکل کر اس نازک وقت میں کچھ خدا اور اس کے دینِ برحق کے لیے بھی دوڑ دھوپ کریں گے۔

---

(۱) یہ اندازہ ۱۹۲۵ء کا ہے، اب صورت حال یقیناً اس سے مختلف ہے۔

آٹھواں باب

اسلام پر کفر کی یورش کے اسباب

بنگال کے مسیحی مبلغین نے اپنی ایک کانفرنس میں مسلمانان بنگال کو مسیحیت کی دعوت دینے کے متعلق جو تجویزیں منظور کی ہیں وہ اخبارات میں چھپ چکی ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ قارئین کرام میں سے کتنے ان سطور کو پڑھ کر کچھ اچنبھے اور کچھ رنج کی سی کیفیت ظاہر کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے ہوں گے اور کتنے ان سے سبق لے کر آمادۂ عمل ہوئے ہوں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ اب ہماری شور پسندی ایک مرض کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ اب ہم اس بات کے عادی ہو گئے ہیں کہ جب کبھی مخالفین کے کسی بڑے حملے یا خاص منصوبے کی ہم تک اطلاع پہنچتی ہے تو دفعتاً چونک پڑتے ہیں اور ایک بدحواسی اور اضطراب کے عالم میں کچھ دفاع کی غیر مرتب سی تدبیریں اختیار کرنے لگتے ہیں اور جب خطرہ ذرا کم ہو جاتا ہے تو مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ عیسائی مشنریوں اور آریہ(۱) پرچارکوں کو اپنے اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے ہوئے پچاس سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ اس طویل مدّت میں وہ نہایت خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتے رہے ہیں اور کوئی سال ایسا نہیں گزرا جس میں انہوں نے اپنے ہم مذہبوں کی تعداد میں اضافہ نہ کیا ہو۔ لیکن ہم نے ہمیشہ ان کی خاموشی کو اپنی طرح بے عملی کا ہم معنیٰ سمجھا اور کبھی اپنے بچاؤ کی تدبیر نہ کی۔ ہماری مثال بالکل مارب(۲) کے ان دیہاتیوں کی سی ہے جو اپنے آباء و اجداد کے بنائے ہوئے

---

(۱) ''آریہ پرچار'' نہ صرف ۱۹۲۵ء میں برسرِ کار تھا بلکہ آج بھی ان کی تحریک اسی طرح جاری ہے۔

(۲) مارب: قدیم ملک سبا کا دارالحکومت، جس کے قریب برساتی نالوں پر بند باندھ کر ایک بہت بڑا تالاب بنالیا گیا تھا۔ اسی پر پورے ملک کی زراعت کا انحصار تھا۔ چوہوں کے سوراخ کر دینے کی وجہ سے اس تالاب کا عظیم الشان بند ٹوٹ گیا اور سارے ملک کا نظام آب پاشی تباہ و برباد ہو کر رہ گیا۔

بند کو دیوتاؤں کا بنایا ہوا بند سمجھتے تھے اور اس میں کسی کم زوری یا بوسیدگی کے قائل نہیں تھے۔ جب چوہوں نے اس میں آہستہ آہستہ سوراخ کرنا شروع کیا تو وہ سمجھے کہ یہ معجزے سے بنایا ہوا بند ان چوہوں کے بس کا نہیں ہے، مگر وہی چوہے برسوں کی لگاتار کوشش کے بعد اس حد تک کامیاب ہو گئے کہ اس میں سے پانی رِسنے لگا۔ آخر کچھ پانی کے زور نے اثر دکھایا اور کچھ دیواروں کی بوسیدگی رنگ لائی اور دفعتاً بند ٹوٹ کر ایسا سیلاب آیا کہ دور دور تک کی بستیاں تباہ ہو گئیں۔ یہی حال ہمارا بھی ہے۔ ہمیں اس بات پر تو اعتماد ہے اور ہونا چاہیے کہ اسلام کا بند بہت مضبوط ہے جسے کوئی توڑ نہیں سکتا لیکن ہم نے خود اپنی غفلت سے اسے بوسیدہ کر لیا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ بے حقیقت چوہے جن کے دانت فی الحقیقت چنے سے بھی زیادہ کم زور ہیں اس میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں اور کامیاب ہو رہے ہیں۔

دوسروں کی کامیابی ہماری نااہلی کا ثمر ہے

ہمیں سوچنا چاہیے کہ آخر وہ کیا چیز ہے جس کی بنا پر آریہ پرچارکوں اور عیسائیوں کو ہمارے مقابلے میں آنے کی جراءت ہوتی ہے۔ ان کے مذہب کو دیکھیے تو وہ ایسے خرافات کا مجموعہ ہے کہ وہ اسے ہمارے سامنے پیش کرنا تو درکنار خود بھی جب کبھی سنجیدگی کے عالم میں غور کرتے ہوں گے تو شرماتے ہوں گے۔ پھر آخر کوئی بات تو ہے کہ وہ اپنی اس متاعِ بے حقیقت کو لے کر بازار میں آتے ہیں اور کامیاب و بامراد جاتے ہیں۔ اس سوال کی حقیقت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کی یہ کامیابی کچھ ان کی قابلیت سے نہیں بلکہ ہماری ناقابلیت کی رہینِ منت ہے۔ ان کی دکان کا فروغ کچھ اس لیے نہیں ہے کہ ان کی متاع اچھی ہے اور بازار میں اس کی مانگ ہے بلکہ وہ صرف اس لیے بک رہی ہے کہ ہم نے اپنی متاع کی قدر کھو دی ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ کوئی شخص اگر ایک دفعہ نعمتِ اسلام سے بہرہ ور ہو جائے تو دنیا کی کوئی قوت اسے دینِ حق سے پھیرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی، لیکن جب وہ نعمت پیش ہی نہ کی جائے، جب عام مسلمانوں کا اسلام صرف روایتی اور موروثی اسلام رہ جائے، جب انہیں جہالت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے اور وہ اسلام کی خوبیوں سے واقف ہی نہ کیے جائیں تو اس کی مضبوطی اور استحکام پر

اعتماد اور اس کے ناقابلِ تسخیر ہونے پر بھروسہ کیونکر کیا جا سکتا ہے، اور یہ بھروسہ اپنے آپ کو صحیح کیسے ثابت کر سکتا ہے!

خطرے کے حقیقی اسباب اور ہمارے دینی مصائب کے مستقل سرچشمے

پس اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ غیر مسلم مبلغین کو مسلمانوں میں اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے اور انہیں مرتد بنانے کی جس بنا پر جرأت ہوتی ہے وہ خود ہماری اپنی کمزوریاں ہیں۔ جب تک ہم میں یہ کمزوریاں باقی رہیں گی یہ خطرہ بھی باقی رہے گا، اور ہمارے بدقسمت کان ہمیشہ یہ سنتے رہیں گے کہ آج فلاں جگہ آریوں یا عیسائیوں کا حملہ ہوا اور آج فلاں جگہ مسلم قوم ارتداد کے خطرے میں مبتلا ہے۔ وقت کے وقت ان خطرات کے دفاع کی سطحی تدبیریں اختیار کر لینے اور پھر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہنے سے یہ مستقل روگ کبھی دور نہیں ہو سکتا بلکہ اس سے تو یہ اندیشہ ہے کہ کچھ دن بعد ہم ایسے خطروں کی آوازیں سننے کے عادی ہو جائیں گے اور اس طرف توجہ بھی کرنی چھوڑ دیں گے۔ اس کا اگر کوئی علاج ہے تو صرف یہی کہ ہم اپنی اصل کمزوریوں کا علاج کریں اور ان کو دور کرنے کے لیے مستقل اور عملی تدبیریں اختیار کریں، تاکہ ہم میں سے وہ چیز ہی دور ہو جائے جو دشمنوں کو اپنے اوپر حملہ آور ہونے کی دعوت دیتی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ کمزوریاں صرف تین ہیں اور وہی تمام خرابیوں کی اصل ہیں:

(۱) جہالت

ایک یہ ہے کہ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ جاہل ہے اور شریعت اسلام سے اس کی ناواقفیت اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ وہ کلمہ گوئی کی حدود سے بھی خارج ہو گیا ہے، بلکہ عرفِ عام میں یوں کہنا چاہیے کہ نام کا مسلمان بھی نہیں رہا، اس لیے اسے ہر مذہب کے لوگ آسانی کے ساتھ اسلام سے پھیر سکتے ہیں۔

(۲) افلاس

دوسرے یہ کہ مسلمان حد سے زیادہ مفلس ہیں اور ان کا افلاس جہالت سے مل کر ان کے اندر سرمایہ دار مبلغین کے دام میں گرفتار ہونے کی استعداد پیدا کر دیتا ہے۔

(۳) مشنری مدارس

تیسرے یہ کہ مسلمانوں کے لڑکے اپنے قومی مدارس نہ ہونے کے باعث مشنری مدارس میں داخل کردیے جاتے ہیں[1] اور وہاں ان کی لوحِ سادہ پر بچپن ہی سے مسیحیت کا نقش بیٹھ جاتا ہے جو آگے چل کر بعض اوقات خفیہ اور بعض اوقات علانیہ ارتداد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

یہ ہمارے دینی مصائب کے مستقل سرچشمے ہیں۔ ان کی پیدائش کے اسباب اس قدر کثیر التعداد ہیں کہ نہ تو ان کا پوری طرح احصاء کیا جاسکتا ہے اور نہ اس جگہ ان پر کوئی مفصّل بحث کی جاسکتی ہے۔ تاہم اگر ان پر مجموعی حیثیت سے ایک نظر ڈالی جائے تو بر بنائے استخراج ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان میں چند اسباب اصل و بنیاد کا حکم رکھتے ہیں۔ مثلاً:

غیر اسلامی طریقوں کا رواج، مسلمانوں کا قوائے ملّی کا غیر معمولی انتشار اور مسلمانوں میں سرمایہ کی قوت کا عدمِ احساس، جو افلاس میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔

ہماری سادگی اور کوتاہ اندیشی اور مخالفین کی عیّاری اور تدبّر

ان کمزوریوں اور ان کے اسباب میں سے ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے کہ جسے ہم دوسروں کی طرف منسوب کرسکتے ہوں یا جس کا منبع ہمارے مخالفین کے اندر موجود ہو۔ پھر اگر ہم ان کے مقابلے پر پروپگنڈہ کریں یا مجالس مذاکرہ منعقد کریں یا کبھی ارتدادزدہ علاقوں میں چکر لگانے کے لیے اپنے مبلغین بھیج دیا کریں، جیسا کہ اب تک ہمارا طریقہ کار رہا ہے تو یقیناً یہ مرض کا اصل علاج نہیں ہوسکتا، اور نہ اس سے یہ آئے دن کے روگ کسی طرح دور ہوسکتے ہیں۔ اگر ہمارے مخالفین کا طریقہ کار بھی یہی ہوتا تو شاید ان کے مقابلے میں ان طریقوں سے ہم کامیاب ہوسکتے۔ لیکن انہوں نے تو پروپیگنڈہ اور وعظ و تلقین کو صرف ہمیں مشغول رکھنے کے لیے حیلہ بنا رکھا ہے ورنہ دراصل ان کے طریقِ کار بالکل ہی مختلف ہیں۔ وہ ہماری سیاسی و اقتصادی غلامی، ہمارے

---

(۱) ۱۹۲۵ء کے حالات کے مطابق ''قومی مدارس'' نہ ہونے والی بات صحیح اور مناسب تھی، لیکن آج قومی مدارس کثیر تعداد میں موجود ہونے کے باوجود مسلمان لڑکے مشنری اسکولوں میں داخلہ لیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب صرف قومی مدارس کی کمی ہی علت غائی نہیں ہے بلکہ اس مرض کی جڑ مغرب پرستی اور مذہبی تعلیم کی کمی ہے۔ اسکولوں میں داخلے سے پہلے مکتب یا گھر پر قرآن کی ابتدائی تعلیم ضروری ہے۔

علماء کی غفلت ہماری قوتوں کے انتشار، ہماری اپنے مذہب سے عام ناواقفیت اور ہماری تمام دوسری کمزوریوں سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ انہوں نے ہزاروں شفاخانے قائم کر رکھے ہیں، جہاں خدمت بنی نوع انسان کے پردے میں وہ نہایت ہوشیاری کے ساتھ جاہل مریضوں کو اپنے مذہب کی تلقین کرتے ہیں۔ انہوں نے ہزاروں یتیم خانے کھول رکھے ہیں جہاں بے شمار یتیم اور لاوارث بچوں کو مسیحیت کی گھٹی پلائی جاتی ہے۔ انہوں نے اپنے انتظامات ایسے مکمّل کر رکھے ہیں کہ جہاں کہیں قحط پڑتا ہے یا اور کوئی آسمانی بلا نازل ہوتی ہے تو تمام بے خانماں لوگوں کو پناہ دیتے ہیں اور روٹی کپڑے کے احسان کی صورت میں اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں۔ انہوں نے ہندستان کے طول وعرض میں ہزارہا مدرسے اور کالج قائم کر رکھے ہیں جہاں نہایت آہستگی اور تدریج کے ساتھ بچوں کو ارتداد کی طرف مائل کیا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے اندر اس قدر صبر و استقامت، اس قدر ایثار و خدمت اور اس قدر سچا مذہبی شغف پیدا کیا ہے کہ وہ برسوں ایک ایک مقام پر ترک و تجرّد کے عالم میں بسر کر دیتے ہیں، فقیروں اور یوگیوں کی سی زندگی اختیار کرتے ہیں اور نہایت خاموشی کے ساتھ لوگوں میں اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ان میں اس قدر عقل و تدبّر موجود ہے کہ اگر خالصتاً نہیں تو کم از کم تصنّع کے ساتھ وہ لوگوں کے سامنے ایسی سادہ اور ایسی پرہیزگارانہ اور ایسی بہتر اخلاقی زندگی کا نمونہ پیش کرتے ہیں کہ ان کی زبان و قلم سے زیادہ خود ان کی زندگی ہی ایک مستقل ذریعۂ تبلیغ بن جاتی ہے اور پھر ان سب باتوں کے ساتھ ہمارے مخالفین کے ایک گروہ میں یہ عیّاری بھی بدرجۂ اتم موجود ہے کہ وہ ہمارے موجودہ افلاس سے فائدہ اٹھا کر ہم پر اقتصادی دباؤ ڈالتے ہیں اور روپے کی قوت سے اپنے مذہب کی اشاعت میں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ طریقے کس قدر عمیق اور کارگر ہیں۔ ان کی مثال بالکل ایک سیلاب کی سی ہے جو ایک ہی وقت میں شور بھی مچاتا ہے، عمارتوں کو تہ و بالا بھی کرتا ہے اور سَیل بن کر بڑے بڑے ایوانوں کی بنیادیں بھی ڈھا دیتا ہے۔ اس کے مقابلے میں نہ معمولی تختہ بندی کام دے سکتی ہے اور نہ محض لیپا پوتی۔ اس کے لیے تو ضرورت ہے کہ ہم بھی اتنے ہی عمیق اور کارگر ذرائع اختیار کریں جتنے ہمارے مخالفین نے اختیار کر رکھے ہیں ورنہ مدافعت میں ہمارا کامیاب ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ محال ہے۔

نواں باب

تدابیر دفاع

ہم ان خطرات اور اندرونی کم زوریوں پر بحث کر چکے ہیں جن سے خاکم بدہن، ہندستان[1] میں اگر اسلام کے فنا ہو جانے کا نہیں تو کم از کم غریب وستم دیدہ ہو جانے کا قوی اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔[2] ہم نے اختصار کے ساتھ قارئین کے سامنے ان عمیق اور نہایت کارگر تدابیر کا بھی ایک خاکہ کھینچ دیا ہے جو اسلام کے مخالف اس کی قوت کو توڑ دینے کے لیے استعمال کر رہے ہیں اور یہ واضح ہو گیا ہے کہ ہم بھی جب تک اتنی ہی عمیق اور کارگر تدابیر اختیار نہیں کریں گے اس وقت تک ہمیں اسلام کی حفاظت اور اشاعت میں کامیابی نہیں ہو سکتی۔ اب ہم اس مسئلہ پر روشنی ڈالنا ضروری سمجھتے ہیں کہ دفاع کے لیے ہمیں کیا کیا تدابیر اختیار کرنا چاہئیں اور ہمارا طریقۂ کار کیا ہونا چاہیے۔

(۱) تعلیمات اسلامی کی عام اشاعت اور مذہبی شعور کی بیداری

ہم یہ عرض کر چکے ہیں کہ ہماری سب سے بڑی کم زوری جہالت ہے۔ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ اپنے مذہب کی تعلیمات، اس کے عقائد اور شعائر سے یکسر جاہل ہے اور یہی چیز ہے جو اعداء کو اسے مرتد بنانے میں سب سے زیادہ مدد دیتی ہے۔ پس اس لحاظ سے ہماری پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہم ہندستان[3] کے تمام جاہل مسلمانوں میں تعلیمات اسلامی کی اشاعت کریں۔

---

(۱) مراد ہے تقسیم سے قبل کا ہندستان۔

(۲) یاد رہے کہ مصنف نے یہ بات ۱۹۲۵ء کے حالات کے سلسلے میں لکھی تھی نہ کہ آج کے حالات کے سلسلے میں۔

(۳) مراد ہے تقسیم سے قبل کا ہندستان، یعنی موجودہ پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش۔

اسلام کے سادہ عقائد ان کے ذہن نشین کردیں اور ان کے اندر اس حد تک مذہبی روح پیدا کردیں کہ وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند ہوجائیں۔ اس کے لیے ہم کو عام طور پر دیہات وقصبات میں ایک ایک شخص ایسا مقرر کرنا چاہیے جو عوام کو ان کے فرصت کے اوقات میں نہایت تدریج کے ساتھ مذہبی تعلیم دے سکے اور خود انہی کی زبان میں انہیں اسلام کی خوبیوں سے آگاہ کرتا رہے۔ اگرچہ اس سلسلے میں غیر مسلموں کو بھی اسلام کی طرف دعوت دی جاسکتی ہے مگر اس وقت ہماری تمام تر توجہ خود مسلمانوں کو مسلمان بنانے کی طرف مبذول رہنی چاہیے ان کی سوئی ہوئی مذہبیت کو جگا دینے کے بعد جب ہم ایک دفعہ اپنے اندرونی استحکامات کو تمام بیرونی حملوں کے خطروں سے محفوظ کرلیں گے تو پھر ہمیں دوسروں کی طرف رُخ کرنے کا مناسب موقع مل سکے گا۔

(۲) مکاتب کا قیام

اس کے ساتھ ہی دوسری چیز یہ ہے کہ مسلمان بچوں کو ابتدائی دینی تعلیم دینے کے لیے گاؤں گاؤں میں مکاتب قائم کردیے جائیں۔ اس کے لیے بھی کسی لمبے چوڑے نظام اور کسی خاص درسی نصاب کی ضرورت نہیں۔ انہیں مسلمان بنانے کے لیے ابتداءً صرف اتنا کافی ہے کہ نہایت سادگی کے ساتھ اسلامی عقائد ان کے ذہن نشین کردیے جائیں۔ وضو، استنجاء، نماز، روزہ وغیرہ کے متعلق معمولی مسائل یاد کرادیے جائیں اور قرآن مجید پڑھا دیا جائے۔ قرآن مجید کو محض طوطے کی طرح پڑھ لینا ہی انسان پر اتنا اثر کرتا ہے کہ اسلام کی عظمت دل میں بیٹھ جاتی ہے اور پھر بہ مشکل ہی کوئی چیز اسے زائل کرسکتی ہے۔ پس اگر ہم اتنی استطاعت نہیں رکھتے کہ اپنے بچوں کو کوئی کارآمد تعلیم دے سکیں تو کم ازکم ان کی لوح سادہ پر قرآن کا گہرا نقش تو ضرور بٹھا دینا چاہیے تاکہ ان پر کفر کا جادو نہ چل سکے۔

> یہ وہ کم سے کم کام ہے جسے انجام دینے میں ہمیں ذرّہ برابر بھی توقف نہ کرنا چاہیے۔ اس کے لیے سفری مبلغین کارآمد نہیں ہوسکتے۔ بلکہ ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو مستقل طور پر ایک مقام پر رہ پڑیں، اور مشنریوں کی طرح دیہاتی زندگی کی تکلیفیں برداشت کرکے پورے عزم واستقلال کے ساتھ

دین وملت کی خدمات انجام دیں۔ ان میں اتنی استقامت ہونی چاہیے کہ کامیابی کے ساتھ لوگوں کی جاہلانہ فطرت کا مقابلہ کرسکیں۔ اوّل اوّل کی ناکامیوں سے ہمت نہ ہاریں۔ مشرکانہ عقائد اور رسوم و بدعات کو دور کرنے میں اگر کئی کئی برس بھی لگ جائیں تو بددل نہ ہوں اور جلد بازی کر کے جہالت سے جنگ نہ کریں۔ بلکہ آہستہ آہستہ وعظ و تلقین اور تعلیم و تبلیغ کے ذریعے طبیعتوں کو اصلاح کی طرف مائل کریں۔ اس کے ساتھ ہی ان میں قربانی کا اتنا جذبہ بھی ہونا چاہیے کہ وہ اس مفلس قوم سے اپنی دینی خدمات کا کم سے کم معاوضہ لے سکیں، جو عیسائی مشنریوں کی طرح کروڑوں روپیہ پانی کی طرح نہیں بہا سکتی۔ اور ان کے اخلاق میں اتنی پاکیزگی بھی ہونی ضروری ہے کہ سادہ لوح دیہاتیوں کو اپنے اعمال سے برگشتہ کر دینے کے بجائے انہیں اپنے حسن خلق کا گرویدہ بنالیں اور خود اپنے اندر اسلامی زندگی کا ایسا نمونہ پیش کریں کہ لوگ ان سے اسلامی تعلیمات کا عملی سبق حاصل کرسکیں۔

(۳) طبعی حوادث کے اثرات سے بچانے کے لیے محتاج خانوں اور یتیم خانوں کی مستقل تنظیم

اس کے بعد دوسرا درجہ یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کو اس قسم کے طبعی حوادث کے اثرات سے بچانے کے لیے اُقطاعی نظام قائم کریں جو انہیں عیسائی مشنریوں اور آریہ پرچارکوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں ـــــ مثلاً قحطوں اور سیلابوں کے موقع پر ہزار ہا مرد، عورت اور بچے بے خانماں ہو جاتے ہیں، جنہیں کوئی پناہ دینے والا نہیں ہوتا اور مجبوراً انہیں اپنی متاعِ دین و ایمان کے عوض سرمایہ دار مشنریوں سے پیٹ بھر روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا لینا پڑتا ہے۔ اسی طرح رات دن جن بچوں کا کوئی والی و وارث نہیں ہوتا، محض اس وجہ سے آوارا پھرتے ہیں کہ ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے اور اس طرح اکثر انہیں عیسائی یا آریہ یتیم خانے اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں ـــــ یہ ارتداد کے دائمی شکار ہیں جنہیں محض مسلمانوں کی غفلت اسلام کی گود سے چھین کر کفر کی آغوش میں ڈال دیتی ہے انہیں اس خطرہ سے بچانے کے لیے محتاج خانوں کی مستقل تنظیم ضروری ہے، ـــــ اور اس کے لیے یہی لازم نہیں کہ کوئی بہت بڑے پیمانے پر نظام قائم کیا

جائے بلکہ ایسا ممکن نہ ہو تو صرف اتنا انتظام کافی ہے کہ انہیں مشنریوں کے ہاتھوں میں پڑنے سے بچایا جائے۔ یہ ایک دوسرا مسئلہ ہے کہ انہیں کام دینے اور دنیا میں کچھ کر کے دکھانے کے قابل بنانے کی کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ فی الحال ہمارا نقطۂ نظر صرف ان کے اسلام کی حفاظت کا ہونا چاہیے اور یہ اسی طرح ہو سکتی ہے کہ انہیں پناہ دے کر ایسے مسلمان خاندانوں کی خدمت میں دے دیا جائے جو انہیں غلاموں کی طرح نہیں بلکہ قابل رحم خدمت گاروں کی طرح پرورش کر سکیں۔ یا اگر کچھ ہنر مند ہوں تو کسی کار سے لگا دیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ یتیموں اور محتاجوں کا یہ حشر کسی طرح بھی پسندیدہ نہیں ہے۔ لیکن اگر ہماری قوم میں اتنا احساس نہیں ہے کہ وہ اپنے نونہالوں کی پرورش کا کوئی بہتر انتظام کرنے کے اسباب بہم پہنچائے تو ہمیں حسبِ ارشادِ نبوی[(۱)] دو بلاؤں میں سے ایک چھوٹی بلا کو قبول کرنا چاہیے اور یقیناً ایک مسلمان بچے کا مسلمان رہ کر خدمت گار بن جانا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ وہ کفر کا طوق گلے میں ڈال کر بیرسٹر بن جائے۔

(۴) مشنری تعلیمی اداروں کا مقاطعہ

ایک اور ضروری تدبیر یہ ہے کہ مسلمان لڑکوں کو مشن اسکولوں اور کالجوں سے اٹھانے کی ایک باقاعدہ تحریک شروع کی جائے۔ ان مدارس کا مقصد علم و فن کی روشنی پھیلانا نہیں ہے بلکہ بچوں کو ان کے مذہب سے پھیر کر سینٹ پال کے خود ساختہ مذہب کی دعوت دینا ہے، اور عام طور پر ان کی تعلیم کا لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ اگر طلبہ علانیہ مرتد نہیں ہوتے تو کم از کم اپنے مذہب سے برگشتہ ضرور ہو جاتے ہیں۔ ان کے دل میں اسلام کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی۔ اسلامی عقائد سے صریحاً انحراف پیدا ہو جاتا ہے۔ عبادات کو کھیل سمجھنے لگتے ہیں۔ اسلامی شعائر کی کھلی کھلی توہین کرتے ہیں اور صرف خاندانی قیود اور رسمی مزاحمت کے باعث اسلام کے ساتھ ان کا رشتہ برائے نام رہ جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بقول مسٹر آرنلڈ مشنری مدارس کی تعلیم نے بعض اوقات بالکل الٹا اثر بھی کیا ہے اور بعض طلبہ مرتد ہونے کے بجائے مسیحیت کی کمزوری سے واقف ہو کر اس کے زبردست حریف بن گئے ہیں، مگر ایسی سعید روحیں بہت کم پائی جاتی ہیں۔ عام طور پر تو مشنری

---

(۱) حدیث مذکور سے یہ شرعی قاعدہ اخذ کیا گیا ہے کہ جب دو ناجائز (یا ناپسندیدہ) کاموں میں سے کسی ایک کا اختیار ناگزیر ہو جائے تو ان میں سے وہ اختیار کیا جائے جو کم تر درجے کا ناجائز (یا ناپسندیدہ) کام ہو۔ اس قاعدے کو اختیارِ اَھوَنُ البَلِیَّتَین کا نام دیا گیا ہے۔

مدارس کے طلبہ کی وہی حالت دیکھی جاتی ہے جو ہم پہلے عرض کر چکے ہیں اور یقیناً انہیں اس بے دینی کے خطرے سے نکالنا ایک عظیم خدمت دینی ہے۔

اس تحریک کے خلاف یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ پہلے ہی مسلمانوں میں تعلیم کی کمی ہے اوراس کے لیے کوئی معقول انتظام نہیں ہے، اس پر اگر مشنری مدارس کا بھی بائیکاٹ کر دیا جائے تو پھر ہمارے بچے آخر کہاں پڑھیں۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ اوّل تو مشنری مدارس کی کمی کو سرکاری اور اسلامی مدارس مل کر پورا کر سکتے ہیں، جن کی تعلیم ان سے بدرجہا زیادہ قابل ترجیح ہوتی ہے لیکن اگر وہاں بھی اس کی تلافی نہ ہوتو:

> ایک سچے مسلمان کے نقطۂ نظر سے مذہب کو اعلیٰ تعلیم پر کسی طرح قربان نہیں کیا جاسکتا۔ اگر مشنری مدارس کے سوا مسلمانوں کو اپنی تعلیمی ضروریات پوری کرنے کے لیے کوئی ٹھکانہ میسّر نہ آئے تو اسے قبول کرنے سے اس کو ٹھکرا دینا زیادہ بہتر ہے، کیوں کہ ہمارے بچوں کا اسلام سے پھر جانا ان کے جاہل رہ جانے سے زیادہ بڑی مصیبت ہے۔

پس ضرورت ہے کہ مشنری تعلیم گاہوں کے خلاف پوری سرگرمی کے ساتھ پروپیگنڈہ کیا جائے اور صرف پروپیگنڈہ ہی نہیں بلکہ عملاً ہر مسلمان کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنے بچوں کو ان مدارس سے اٹھالے۔

(۵) اقتصادی غلامی سے نجات

آخری اور موجودہ حالات میں سب سے زیادہ ضروری تدبیر یہ ہے کہ مسلمانوں کو ان کی موجودہ اقتصادی غلامی سے نکالا جائے۔ ہندستانی مسلمانوں کی اقتصادی فلاح کا سب سے بڑا ذریعہ حکومت تھی۔ ان میں تجارت اور سرمایہ داری کا ذوق کبھی نہ تھا۔ صرف ایک صنعت و حرفت کا قدرتی ذوق موجود تھا، سواس کے فوائد کا انحصار بھی حکومت اور متوسّلین حکومت کی قدردانیوں پر تھا۔ جب یہ حکومت چلی گئی تو ان کی خوش حالی اور دولت مندی کا سرچشمہ بھی سوکھ گیا اور اب یہ حالت ہے کہ جتنے صنعت و زراعت پیشہ مسلمان ہیں سب کے سب سرمایہ دار مہاجنوں کے غلام ہیں اور جنھیں اللہ نے آبائی ثروت عطا کی ہے وہ اپنے بگڑے ہوئے نظام تمدّن اور

اپنی غلط مسرفانہ عادات کے باعث روز بروز اسے قرض داری کی نذر کرتے چلے جارہے ہیں۔

شہروں اور بڑے بڑے قصبات میں تو یہ صرف اقتصادی غلامی ہی تک محدود ہے مگر دور دراز کے دیہات میں یہی چیز ارتداد کا سب سے زیادہ کارگر ہتھیار بن گئی ہے اور غیر مسلم مبلغین پوری مستعدی کے ساتھ جاہل مسلمان دیہاتیوں کو مرتد بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پس حفاظت اسلام کے لیے اس بیماری کا علاج بھی نہایت ضروری ہے، بلکہ شاید موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بھی غلط نہ ہو کہ اس وقت جو چیز ہندستان[1] میں مسلمانوں کے وجود کو دھمکی دے رہی ہے وہ یہی اقتصادی خطرہ ہے۔

یا چناں کُن یا چنیں

یہ ایک مستقل بحث ہے کہ مسلمانوں کو اس خطرے سے بچانے کے لیے کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں اور اس پر یہاں بحث کرنے کی گنجائش بھی نہیں۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ اس عظیم الشان کام کو انجام دینے کے لیے ہماری قوتوں کا موجودہ انتشار اور ہماری قومی جماعتوں کا موجودہ افتراق کسی حیثیت سے بھی موزوں نہیں ہے۔ ہم ابھی تک ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجدیں قائم کرنے میں مشغول ہیں اور یہاں پوری قوم کی متحدہ قوت درکار ہے۔

> ہمیں ابھی تک ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی عادت پڑی ہوئی ہے اور یہاں برسوں کی لگاتار اور انتھک محنتوں کی ضرورت ہے۔ ہم کو ابھی تک سطحی شور اور ہنگامے میں مزا آتا ہے اور یہاں دراصل مقصد کا گہرا شعور اور اس کے لیے حقیقی اخلاص و ایثار مطلوب ہے۔ ہمیں ابھی تک صرف آگ کی طرح بھڑک کر جلا دینا آتا ہے، مگر یہاں اس کی حاجت نہیں ہے، اب تو ہمیں ایسی ہلکی سی حرارت کی ضرورت ہے جو برسوں تک اندر ہی اندر پکا کر لعل و گوہر تیار کر دیتی ہے۔

پس تمام تدبیریں اور تمام تجویزیں اس وقت تک بے کار ہیں جب تک ہم کو کام کرنے کا صحیح ڈھنگ نہ آجائے۔ اگر تحریکات میں یہی جذبہ برابر کام کرتا رہے اور اگر ہم دوسروں سے

---

(۱) غیر منقسم ہندستان مراد ہے۔

مقابلے کے بجائے آپس کے مکابرہ ہی میں بدستور مشغول رہیں اور اگر ہمارے تمام کام اجتماع و ائتلاف کے اسلامی اصول کے بجائے افتراق کے خالص غیر اسلامی اصول پر چلتے رہیں، تو پھر بہتر ہے کہ یہ تمام اسکیمیں لپیٹ کر رکھ دی جائیں اور ایک دفعہ ہم سب یہاں اسلام کے مستقبل کی فاتحہ پڑھ کر اپنے اپنے دل پسند مشاغل میں مصروف ہو جائیں۔

پس اے معمارانِ حرم!

جس طرح ایک عمارت تیار کرنے کے لیے اچھے ساز و سامان سے زیادہ معماری کی اعلیٰ قابلیت درکار ہوتی ہے، اسی طرح ہمیں مفید تدبیروں اور کارآمد تجویزوں سے زیادہ کام کرنے کی صلاحیت درکار ہے۔ دوا خواہ کتنی ہی مفید اور کارگر ہو لیکن اگر طبیب میں علاج کرنے کی قابلیت نہ ہو تو وہ مریض کے لیے کچھ بھی مفید نہیں ہو سکتی۔ پس اگر ہماری قوم کے اربابِ حل و عقد وقت کی نزاکتوں کو ٹھیک ٹھیک محسوس کرتے ہیں تو انہیں تمام دوسرے ملحوظات کو نظر انداز کر کے سب سے پہلے تنظیمِ قوائے ملّی کی طرف توجہ کرنی چاہیے اور جلد سے جلد اس طوائف الملوکی کا خاتمہ کر دینا چاہیے جو اس وقت ہماری تمام قومی تحریکوں میں جاری و ساری ہے۔